رابطہ ادبِ اسلامی (عالمی) کا

سہ ماہی اُردو ترجمان

کاروانِ ادب

بانی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

مدیر مسئول

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

مرکزی دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی)

سہ ماہی کاروانِ ادب اسلامی

مجلس مشاورت

پروفیسر عبداللہ عباس ندوی، مکہ مکرمہ
مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، لکھنؤ
مولانا حافظ فضل الرحیم صاحب
ڈاکٹر محمود الحسن عارف
مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، لکھنؤ
پروفیسر محمد راشد ندوی، علی گڑھ
پروفیسر ظہور احمد اظہر
مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

مدیر مسئول

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم شعبۂ برصغیر)

مجلس ادارت

پروفیسر محمد اجتباء ندوی، دہلی
پروفیسر محسن عثمانی ندوی، C.I.E.F.L. حیدرآباد
ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ندوی، اے، ایم، یو، علی گڑھ
مولانا نذر الحفیظ ندوی، لکھنؤ
ڈاکٹر سید ضیاء الحسن، لکھنؤ

معاون انتظامی

اقبال احمد ندوی

معاون طباعت

انیس احمد ندوی

طباعت: کاکوری آفسٹ پریس، لکھنؤ

کمپوزنگ: ——— حامد خوشنویس۔ لکھنؤ

زرتعاون

اس شمارہ کی قیمت	۴۰/- روپے
سالانہ برائے ہندوستان	ایک سو پچاس روپے
پاکستان و بنگلہ دیش	تین سو روپے یا دس امریکی ڈالر
ان کے علاوہ دیگر ممالک	چار سو روپے یا بارہ امریکی ڈالر

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں ..... RABITAT-AL-ADAB-AL-ISLAMI (INDIA)

صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ

فہرست مضامین

جلد نمبر ۱۲	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۵ء	شمارہ نمبر ۳

عناوین		صفحہ نمبر
منزل بہ منزل	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۴

مقالات

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ترجمۂ قرآن پر ایک نظر	ڈاکٹر احتشام احمد ندوی	۸
سمیع اللہ اسد کا ''قرآن منظوم'' منظوم تراجم کے باب میں ایک ناپسندیدہ اضافہ (سورہ بقرہ کی روشنی میں)	مولانا صباح اسماعیل ندوی، علیگ	۲۰
علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت صحافی	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۶۷
عامر عثمانی ایک فراموش شدہ عالم	مولانا محمد شعیب کوٹی	۷۲
محدث دکن حضرت مولانا عبداللہ شاہؒ کی تحریروں اور تقریروں میں کردار سازی کے عناصر	ڈاکٹر مفتی احتشام الحق قاسمی علیگ	۸۹
شاعر مشرق علامہ اقبال اور مغربی تہذیب پر سخت تنقید	مولانا مہتاب عالم رشادی ندوی	۱۰۶
جدید عربی نثر اور اس کے مختلف رنگ	پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی (مرحوم)	۱۱۵

شعر و ادب

حمد	صبیح رحمانی	۱۳۳
غزل	رشید کوثر فاروقی	۱۳۴
غزل	محمد حسین فطرت	۱۳۵

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

منزل بہ منزل

اللہ تعالیٰ نے مخلوق انسانی کو جو وجود بخشا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنا یہ احسان بھی ظاہر کیا ہے کہ انسان کو قوت بیان کی خصوصیت بھی عطا فرمائی، فرمایا: ﴿خلق الإنسان ، علّمه البيان﴾ (سورہ رحمٰن:۳-۴) کہ انسان کو پیدا کیا اور اس کو قوت بیان عطا کی۔

قوت بیان کیا ہے؟ وہ کسی معاملہ میں اپنے احساس یا رائے سے دوسرے کو واقف کرانے کی صلاحیت ہے۔ انسان کی یہ صلاحیت ایک بڑی قیمتی صلاحیت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہے، اور یہ اس کے قوت نطق وکلام کے ذریعہ عمل میں آتی ہے۔ اس صلاحیت کو جب سلیقہ سے عمل میں لایا جاتا ہے تو خاصی مؤثر ثابت ہوتی ہے، اور بعض وقت اس کے اثر سے مخاطب کے رجحانات، میلانات اور احساسات میں تبدیلی بھی آجاتی ہے۔ نطق وکلام کو مناسب ڈھنگ اور مخاطب کے فہم وادراک کی رعایت کے ساتھ جب استعمال کیا جاتا ہے تو اس کلام کو ادب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ادب کا لفظ عربی کا لفظ ہے، جس کے اصل معنی شائستگی اور طور وطریق

میں سلیقہ مندی کے ہیں۔اسی بنا پر بولنے اور بات کرنے میں جب مضمون کلام شائستگی اور سلیقہ مندی سے تعلق رکھتا ہے تو اس کو ادب سے تعبیر کرنے لگے، پھر بتدریج عربی سے تعلق رکھنے والی دیگر قوموں کی زبانوں میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہونے لگا۔

ادب اپنے معنی ومفہوم کے لحاظ سے انسانی زندگی کے ستھرے اور پسندیدہ پہلوؤں کی ترجمانی کرنے کا ایک مفید ذریعہ ہے، اسے زندگی کے کسی خاص ایک یا دو پہلوؤں کے ساتھ مخصوص سمجھنا کہ اس سے ہٹ کر دوسرے پہلو میں استعمال نہ ہو، صحیح بات نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کو زندگی کے مختلف مقاصد اور ضرورتوں میں استعمال کرنا بھی صحیح اور درست ہے، لیکن کچھ گروہی عصبیت کے حامل لوگ اس کو انسانی زندگی کے صرف اپنی پسند کے کسی پہلو کے ساتھ مخصوص کر لیتے ہیں، اور اس کے علاوہ کے لئے اس کو کام میں لانے کو صحیح نہیں سمجھتے، یہ ادب کے ساتھ بھی اور زندگی کے دیگر پہلوؤں کے ساتھ بھی حق تلفی کی بات ہے، مگر عجیب بات یہ ہے کہ ادھر کچھ مدت سے ادب کو صرف ایک گروہ جو اپنے کو ترقی پسند اور آزاد فکر کا گروہ سمجھتا ہے، کے اظہار احساس واظہار رائے کے ساتھ مخصوص رکھا جانے لگا، اور اس میں ایسی صورت اختیار کی گئی کہ اس میں انسانوں کی خواہش اور پسند کے پہلو کو زیادہ اہمیت دی گئی، اس کے باعث ادب کے اس نوع کو رواج بھی زیادہ ملا، اور اسی کی بنیاد پر اس کے کام کرنے والوں کی طرف سے عام طور پر اپنے کام کو اسی میں مرکوز رکھنے پر اصرار بھی رہا۔

اس طریقہ سے ادب کی صلاحیت رکھنے والوں میں ایک ایسا گروہ بن گیا جس کی اصل پہچان ادب کے ساتھ مخصوص سمجھی گئی، اور ادیب کہلانے کے وہی مستحق سمجھے گئے۔ پھر ان میں گروہی عصبیت بھی پیدا ہوگئی کہ جس کی اصل پہچان ادب کی ہی سمجھی گئی، اور جو اس گروہ میں نہ ہو، اس کے ادب کو ادب تسلیم نہیں کیا جاتا، حالانکہ ادب ادب ہے، خواہ وہ کسی کے قلم سے ہو، کسی بھی موضوع کا ہو۔

اور عجیب بات یہ ہوئی کہ ادب کو انسان کی صرف نفسیاتی رغبت و پسند کے ساتھ مخصوص کر لینے کی بنا پر کسی کے ادب میں اخلاق اور مذہب کی کوئی بات آئے تو اس کو ادب میں شمار نہیں کیا جاتا، بلکہ اگر اس کو کوئی ادب میں شمار کرے تو قابل رد بات سمجھی جاتی رہی، حالانکہ ادب کے لئے موزوں بات یہ ہے کہ انسان کی یہ صلاحیت انسان کے صحیح اور صالح مفاد کے لئے استعمال ہو۔ اور انسان کے مفاد کی جو جو قسمیں اور پہلو ہیں، ان سب کو اس کے ذریعہ ان کا حق پہنچتا رہے۔ یہ انسان کی صلاحیت ہے، لہٰذا انسان کے لئے اس کے تمام مفید مقاصد میں استعمال ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ ایک بہت مفید صلاحیت دی ہے۔ اس کا یہ مطلب لینا صحیح نہ ہوگا کہ وہ صرف لطف و تفریح کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ جائے کہ یہ لائق تحسین بات نہیں۔

ہمارا رابطہ ادب اسلامی اسی مقصد کے لئے قائم ہوا ہے کہ ادب کے تصور میں جو محدودیت اور مخصوصیت لازم کر دی گئی ہے اس کو درست کیا جائے، اور انسان کے لئے جو مناسب اور مفید ہو اس کو بھی ادب سے مدد حاصل ہو۔

اور ہم اپنے اسلام کے طویل ماضی کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو ایسے ادب کے بے شمار نمونے ملتے ہیں جن کو ادب کے میدان کو محدود کرنے والوں نے ادب میں شمار نہیں کیا ہے، حالانکہ وہ صرف یہی نہیں کہ ادب کے دائرے میں آتے ہیں بلکہ بعض بعض بہت غیر معمولی ادبی تاثیر اور افادیت رکھتے ہیں۔ ہمیں ان نمونوں کو روشنی میں لانا چاہئے، اور ان سے جو فائدہ انسانی دل و دماغ کو پہنچتا ہے اس سے اپنی زندگی کے معاملات میں مدد لینا چاہئے۔

رابطہ ادب اسلامی نے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے سیمینار منعقد کئے اور صحافتی ذریعہ سے ادب کے اس حصہ کو نمایاں کیا۔ الحمدللہ یہ سیمینار سالانہ سطح پر ہندوستان میں نئے نئے موضوعات پر ہوتے رہے، اور بتدریج لوگوں نے رابطہ کے پیغام کو قدردانی سے دیکھا اور اس میں حصہ لیا۔ ہمارا کاروان ادب بھی اسی خدمت کے لئے نکلا، اور وہ اپنی استطاعت کی حد تک یہ خدمت انجام دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے مدد اور قبولیت کی دعا ہے۔

ڈاکٹر احتشام احمد صاحب ندوی

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ترجمۂ قرآن پر ایک نظر

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے قرآن مجید کا ترجمہ ایک نئے انداز سے کیا ہے، انہوں نے مفہوم کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کے مفہوم کو بامحاورہ اردو میں منتقل کردیں۔ اس کوشش میں وہ کامیاب ہیں۔ انہوں نے یہ ترجمہ اپنی تفسیر تفہیم القرآن کے لئے کیا لیکن افادۂ عام کے خیال سے انہوں نے ترجمۂ قرآن مجید کے نام سے ایک دوسرا ایڈیشن چھاپا ہے جس میں مختصر حواشی ہیں۔ یہ ترجمہ اور حواشی بہت مقبول ہیں، اس کے ایڈیشن بار بار نکل چکے ہیں اس لئے کہ تفسیر قرآن تو چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اس کا پڑھنا آسان نہیں ہے۔ لیکن اس ترجمہ کا پڑھنا آسان ہے۔ مولانا مودودیؒ نے شروع میں عرض مترجم کے نام سے ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں:

''ان صفحات میں ترجمانی و تفہیم قرآن کی جو سعی کی گئی

ہے وہ دراصل اسی بنیاد پر ہے۔ میں ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا کہ ہمارے یہاں تعلیم یافتہ لوگوں میں روح قرآن تک پہنچنے اور اس کتاب پاک کے حقیقی مدعا سے روشناس ہونے کی جو طلب پیدا ہوگئی ہے اور روز بروز بڑھ رہی ہے وہ پچھلے مترجمین کی نہایت قابل قدر مساعی کے باوجود ہنوز تشنہ ہے۔ اس کے ساتھ میں یہ احساس بھی اپنے اندر پا رہا تھا کہ اس تشنگی کو بجھانے کے لئے کچھ نہ کچھ خدمت بھی کرسکتا ہوں، انہی دونوں احساسات نے مجھے اس کوشش پر مجبور کیا جس کے ثمرات ہدیۂ ناظرین کئے جا رہے ہیں۔ اگر فی الواقع میری یہ حقیر پیش کش لوگوں کے لئے فہم قرآن میں کچھ بھی مددگار ثابت ہوئی تو یہ میری بہت بڑی خوش نصیبی ہوگی۔'' (۱)

مولانا نے پھر یہ لکھا کہ اگرچہ ترجمۂ قرآن اتنے ہو چکے ہیں کہ مزید ترجمہ کی گنجائش باقی نہیں رہی، فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے فارسی میں قرآن کا ترجمہ کیا تھا، پھر ان کے دو صاحبزادوں نے اردو میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ، اس کے بعد مولانا محمود حسن دیوبندی شیخ الہندؒ نے قرآن مجید کا ترجمہ اردو میں کیا۔ پھر مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اور مولانا فتح محمد جالندھریؒ نے قرآن کے ترجمے کئے۔ مگر ان تراجم میں لفظی ترجمے کو زیادہ پیش نظر رکھا گیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ان ترجموں سے لفظی ترجمے کی ضرورت پوری ہوجاتی ہے مگر میرے پیش نظر وہ ضرورتیں ہیں جو لفظی ترجمہ پوری نہیں کرتا۔ اس لئے کہ لفظی ترجمہ میں زور بیان، بلاغت زبان اور تاثیر

کلام کا فقدان محسوس ہوتا ہے۔عبارت بے جان سی ہو جاتی ہے، نہ اس کو پڑھ کر روح میں وجدان پیدا ہوتا ہے اور نہ آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں، نہ جذبات میں طوفان آتا ہے نہ خوف سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔مولانا فرماتے ہیں کہ لفظی ترجمے کی چھلنی صرف دوا کے خشک اجزا ہی کو اپنے اندر سے گزرنے دیتی ہے۔ رہی ادب کی وہ تیز وتند اسپرٹ جو قرآن مجید کی اصل عبارت میں بھری ہوئی ہے اس کا کوئی حصہ ترجمہ میں شامل نہیں ہونے پاتا۔وہ اس چھلنی کے اوپر ہی سے اُڑ جاتی ہے۔حالانکہ قرآن مجید کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ جو سنگ دل سے سنگ دل آدمی کا دل پگھلا دیتی ہے، جس نے بجلی کے کڑکے کی طرح عرب کی ساری زمین ہلا دی تھی جس کی قوت تاثیر کا لوہا اس کے شدید ترین مخالفین تک مانتے تھے اور ڈرتے تھے کہ جو یہ جادو اثر کلام سنے گا وہ بالآخر نقد دل ہار بیٹھے گا۔یہ چیز اگر قرآن مجید میں نہ ہوتی اور وہ اسی طرح کی زبان میں نازل ہوا ہوتا جیسی اس کے ترجموں میں ہم کو ملتی ہے تو اس سے اہل عرب کے دل نہ گرماتے اور اسے ہرگز وہ کامیابی حاصل نہ ہوتی جو فی الواقع اس سے حاصل ہوئی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظی ترجمے مربوط اور مسلسل نہیں ہوتے۔دوسری وجہ مولانا کی رائے میں قرآن کے لفظی ترجمے کے غیر مربوط ہونے کی یہ ہے کہ قرآن کا طرز بیان تقریری ہے تحریری نہیں ہے۔تقریر کی زبان کو اگر تحریر میں لایا جائے تو وہ بدل جاتی ہے۔یعنی تقریر کی زبان کا ترجمہ اگر کسی دوسری زبان میں کیا جائے تو وہ غیر مربوط ہو جائے گا۔قرآن مجید کا عالم یہ ہے کہ دعوت اسلامی کے تقاضے سے حالات کے پیش نظر جو خطیبانہ تقریری انداز کی عبارت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی تھی آپ اس کو تقریری شکل میں سناتے تھے۔تقریری زبان کو تحریر میں لانے

سے بے بسی پیدا ہوتی ہے، لیکن وہی تقریر پبلک میں کی گئی تھی تو وہاں وہ مربوط محسوس ہوتی تھی۔ یہی حال قرآن کا ہے اسی بنا پر تفسیر کے ذریعہ سے قرآن کے اندر ربط کو ظاہر کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا سید مودودیؒ مزید فرماتے ہیں کہ:

''میں نے لفظی ترجمہ کے بجائے ترجمانی کا ڈھنگ اختیار کیا ہے، میں نے قرآن مجید پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آیا میں نے اس کو بیان کر دیا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ عربی مبین کی ترجمانی اردوئے مبین سے کروں تا کہ تقریر کا ربط تحریر کی زبان میں ظاہر ہو اور اس شاہانہ ظہور بیان کا اظہار ہو جو قرآن میں موجود ہے۔ لیکن اس راہ کے خطرات کا مولانا کو اندازہ تھا۔ اس وجہ سے مولانا نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ معاملہ کلام الٰہی کا تھا۔ اس لئے میں نے بہت ڈرتے ڈرتے ہی یہ آزادی برتی جس حد تک احتیاط میرے امکان میں تھی اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے اس امر کا پورا اہتمام کیا ہے کہ قرآن کی دینی عبارت جتنی آزادی بیان کی گنجائش دیتی ہے اس سے تجاوز ہونے نہ پائے۔ (۲)

شاہ ولی اللہ دہلوی نے یہ پہلے لکھ دیا ہے کہ قرآن مجید کی زبان تقریری ہے۔ پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی اپنی کتاب حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی میں لکھتے ہیں کہ ''قرآنیات میں فکر ولی اللّٰہی کا اظہار ان کی چار کتابوں ''فتح الرحمٰن، مقدمہ الفوز الکبیر، فتح الخبیر اور مقدمہ در قوانین ترجمہ'' میں ہوا ہے۔ شاہ صاحب کا

بنیادی موقف یہ ہے کہ قرآن مجید چھوٹے چھوٹے خطبات کا مجموعہ ہے جن کو ایک سورت کے قالب میں نظم وترتیب وحسن علاقہ کی بنا پر گوندھ دیا گیا ہے۔ جب متعدد مجموعۂ آیات یا خطبات آجائے تو وہ سورت کی شکل اختیار کر لیتے اور آیتوں کی سورتوں میں ترتیب اور سورتوں کی یکے بعد دیگرے ترتیب و تنظیم ارشاد الٰہی کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی اس لئے وہ توقیفی تھی، قرآن مجید کے یہ خطبات دراصل عرب اول یا معاصرین نبوی کے طریقۂ تقریر واظہار کے مطابق تھے۔ ان میں منطقی ترتیب اور سلسلہ بہ سلسلہ دلائل کی تنظیم کا التزام نہیں کیا جاتا تھا جیسا کہ بعد کے لکھنے والوں کا ہوگیا ہے۔ اس طریقۂ اظہار میں حکمت یہ تھی کہ وہ نافع ہو اور دل میں اتر جائے۔ مختلف اسالیب اور ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب اور ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف التفات ملتا ہے اور ایک علم کا بیان مرکز نہیں کیا جاتا بلکہ پانچوں علوم قرآنی بار بار تصریف کے ساتھ لائے جاتے ہیں، اس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ پانچوں یا دو تین ترتیب سے یا یکے بعد دیگرے آئیں بلکہ ایک خطبہ سے اور دوسرے کو تیسرے سے ایک مخصوص آہنگ کے ذریعہ پرویا جاتا اور وابستہ کر دیا جاتا۔ بعض اوقات مضمون کی مناسبت کی بنا پر خطبوں کو آپس میں جوڑ دیا جاتا ہے حالانکہ ان میں اسلوب کا فرق ہوتا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے اسالیب کے آہنگ کی

رعایت زیادہ کی گئی ہے۔'' (۳)

اس طویل اقتباس سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے قرآن کی تقریری زبان کا نظریہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے مستعار لیا ہے۔

اب یہاں کچھ آیات پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیں:

وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا، وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَ طَعْنًا فِى الدِّيْنِ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا

ترجمہ: ''اور جن لوگوں نے یہودیت کا طریقہ اختیار کیا ان میں کچھ لوگ ہیں جو الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دیتے ہیں اور دین حق کے خلاف فینش زنی کرنے کے لئے اپنی زبانوں کو توڑ مروڑ کر کہتے ہیں سمعنا وعصینا اور اسمع غیر مسمع راعنا۔ حالا کہ وہ اگر کہتے سمعنا واعطنا واسمع وانظرنا تو یہ ان ہی کے لئے بہتر تھا۔ اور راست بازی کا طریقہ تھا مگر ان پر تو ان کی باطل پرستی کی بدولت اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔

بڑی تعجب کی بات ہے کہ حضرت مولانا مودودی صاحب نے سمعنا وعصینا اسمع غیر مسمع، راعنا جیسے خالص عربی الفاظ کے ترجمہ کو چھوڑ دیا ہے۔ ایک اردو داں اس عبارت کو پڑھ کر ہرگز کچھ نہیں سمجھ سکتا۔

حضرت مولانا شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ اس آیت کا ترجمہ اس طرح

کرتے ہیں:

''اور بعض وہ لوگ جو یہودی ہیں، بدل ڈالتے ہیں باتوں کو جگہ اس کی سے اور کہتے ہیں سنا ہم نے اور نہ مانا ہم نے اور سن نہ سنا جائیو اور راعنا پیچ دے کر زبان اپنی کو اور طعن کر کے پیچ دین کے اور اگر وہ کہتے سنا ہم اور مانا ہم نے اور سن اور نظر کر ہم پر البتہ ہوتا بہتر ان کے واسطے ان کے اور بہت سیدھا، لیکن لعنت کی ہے ان کو اللہ نے، ساتھ کفر ان کے۔ پس نہیں ایمان لائے مگر تھوڑا۔''

حضرت مولانا محمود حسن شیخ الہندؒ کا ترجمہ اس آیت کا ملاحظہ فرمایئے:

''بعضے لوگ یہودی پھیرتے ہیں بات کو اس کے ٹھکانا سے اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور نہ مانا اور کہتے ہیں کہ سن نہ سنا جایئو اور کہتے ہیں راعنا موڑ کر اپنی زبان کو اور عیب لگانے کو دین میں اور اگر وہ کہتے ہم نے سنا اور مانا اور سن اور ہم پر نظر کر تو بہتر ہوتا ان کے حق میں اور درست لیکن لعنت کی ان پر اللہ نے ان کے کفر کے سبب سو وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر کم۔''

اس آیت کا ترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ اس طرح کرتے ہیں:

''یہ لوگ جو یہودی میں سے ہیں کلام کو اس کی دوسری طرف پھیر دیتے ہیں اور یہ کلمات کہتے ہیں سمعنا وعصینا اور اسمع غیر مسمع اور راعنا اس طور پر کہ اپنی زبانوں کو پھیر کر اور دین میں طعن زنی کی نیت سے اور اگر یہ لوگ یہ کلمات کہتے سمعنا واطعنا اور اسمع وانظرنا تو یہ بات ان کے لئے بہتر ہوتی۔ اور موقع کی بات تھی مگر ان کو

اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب نبی رحمت سے دور پھینک دیا
اب وہ ایمان نہ لائیں گے مگر تھوڑے سے آدمی۔"

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے ترجمہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بعض عربی الفاظ واصطلاحات کا ترجمہ جوں کا توں اردو میں کر دیتے ہیں حالانکہ ایک اردو داں ان الفاظ کو اور اصطلاحوں کو سمجھ نہیں سکتا اور مولانا نے اس کیفیت کو اپنے ترجمہ کی خصوصیت بنالیا ہے اور انہوں نے بعض آیتوں کے ترجمے میں عربی الفاظ لکھ دیئے ہیں۔جس سے ایک عام اردو داں قاری کو زبردست مشکل پیش آسکتی ہیں جب تک کہ وہ تفسیر نہ دیکھے اور حاشیہ نہ پڑھے وہ ہرگز ترجمہ سے اپنا مطلب نہیں نکال سکتا۔ذیل میں چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

وإذقيل لهم اسكنوا هذالقرية وكلوا منها حيث شئتم وقولوا حطة،وادخلوا الباب سجداً نغفرلكم خطاياكم، وسنزيد المحسنين۔(اعرف:۱۶۱)

"یاد کرو وہ وقت جب ان سے کہا تھا کہ اس بستی میں جا کر بس جاؤ اور اس کی پیداوار سے حسب منشا روزی حاصل کرو اور حطۃ حطۃ کہتے جاؤ اور شہر کے دروازے پر سجدہ ریز داخل ہو ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے اور نیک رویہ رکھنے والوں کو مزید فضل سے نوازے گے۔"

مذکورہ آیت کے ترجمہ میں حطۃ کے معنی مولانا مودودیؒ صاحب نے نہیں دیئے اور نہ کوئی اردو داں اس کو سمجھ سکتا ہے۔

اس آیت کا ترجمہ مولانا محمود حسن شیخ الہندؒ نے اس طرح کیا ہے:

''اور جب حکم ہوا کہ بسو اس شہر میں اور کھاؤ اس میں سے جہاں چاہے اور کہو ہم کو بخش دے اور داخل ہو دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے تو بخش دیں گے ہم تمہاری خطائیں البتہ زیادہ دیں گے ہم نیکی کرنے والوں کو۔''

یہاں حطۃ کا ترجمہ شیخ الہندؒ نے ہم کو بخش دے کیا ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

''اور وہ زمانہ یاد کرو جب حکم دیا کہ تم لوگ اس آبادی میں جا کر رہو اور کھاؤ اس جگہ سے جس جگہ سے تم رغبت کرو اور زبان سے یہ کہتے جانا کہ توبہ ہے توبہ ہے اور عاجزی سے جھکے جھکے دروازہ میں داخل ہونا ہم تمہاری پچھلی خطائیں معاف کر دیں گے (یہ تو سب کے لئے ہوگا) جو لوگ نیک کام کریں گے اس کو مزید برآں اور دیں گے۔''

فکاین من قریة أهلكناها وهي ظالمة فهي خاوية على عروشها وبئر معطلة وقصر مشيد (الحج:۴۵)

''اور کتنی ہی خطا کار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کر دیا اور آج وہ اپنی چھتوں پر الٹی پڑی ہیں کتنے کنویں بے کار اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔''

یہاں مشید کے معنی مضبوط اور مستحکم کے ہیں مگر مولانا مودودیؒ نے موقع کی مناسبت سے کھنڈر ترجمہ کیا ہے۔ مولانا اشرف علی نے بہت سے قلعی چونے کے محل ترجمہ کیا ہے اور محمود حسن دیوبندیؒ نے اس کا ترجمہ محل کیا ہے گچکاری کے۔

گچکاری کے محل مضبوطی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

مولانا مودودی کے پیش نظر مرادی معنی ہیں لہٰذا مضبوط کے بجائے کھنڈر کیا ہے جو معنی کے لحاظ سے صحیح نہیں مگر مراد اور مقصود کے لحاظ سے صحیح ہے اس لئے کہ وہ ترجمہ نہیں ترجمانی کرتے ہیں اسی طرح مولانا نے طاغوت کا ترجمہ نہیں کیا مندرجہ ذیل آیت ملاحظہ ہو:

"یریدون أن یتحاکموا إلی الطاغوت وقد أمروا أنیکفروابه

"مگر وہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں۔حالانکہ ان کو طاغوت سے کفر کا حکم دیا گیا تھا۔"

مولانا محمود حسن شیخ الہند نے طاغوت کا ترجمہ ہڑدگنہ کیا ہے دوسری جگہ شیطان بھی کیا ہے۔

لاتعدوافی السبت (البقرۃ:۱۵۳)

اس کا ترجمہ مولانا نے اس طرح کیا ہے:

"ہم نے ان سے کہا کہ سبت کا قانون نہ توڑو"

اب جب تک کہ قاری سبت کے معنی نہ سمجھ لے وہ کچھ نہیں سمجھ سکتا۔یہاں بھی مولانا نے اپنی خصوصیت کو برقرار رکھا ہے۔اسی طرح انہوں نے قوامین کا ترجمہ نہیں کیا ہے۔اور محصنات کا بھی ترجمہ کہیں کیا ہے اور کہیں نہیں کیا ہے۔

بعض جگہ بعض الفاظ کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے مثلاً مندرجہ ذیل آیت ملاحظہ ہو:

لـو یـجدون ملجأ أومغاراۃ أومدخلاً لولّوا إلیه وهم یجمحون (سورۂ توبہ:۵۷)

''اگر وہ کوئی جائے پناہ پالیں یا کوہ یا گھس بیٹھنے کی جگہ تو بھاگ کر
اس میں جا چھپیں''

اس ترجمے میں وھم یجمحون کا ترجمہ حضرت مولانا مودودی نے بالکل چھوڑ دیا ہے اس کے برعکس مولانا محمود حسن شیخ الہندؒ اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

''اگر وہ پائیں کوئی پناہ کی جگہ یا غار یا سرنگ یا سر گھسانے کی جگہ
تو الٹے بھاگیں اس طرف رسیاں تڑاتے۔''

یجمحون کا ترجمہ شیخ الہندؒ نے رسیاں تڑاتے کا کیا ہے اور مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس طرح کیا ہے:

''ان لوگوں کو اگر کوئی پناہ کی جگہ مل جاتی یا غار یا گھس بیٹھنے کی
جگہ (مل جاتی) تو یہ ضرور منھ اٹھا کر چل دیتے۔''

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ترجمۂ قرآن بہت رواں دواں ہے بقول انہی کے اردوئے مبین میں کیا گیا ہے ان کی اردو عبارت بہت سلیس واضح اور عام فہم ہے ان کو اللہ تعالیٰ نے سمجھانے اور تشریح کرنے کی فطری صلاحیت عطا کی تھی جس سے انہوں نے پورا کام لیا اور اس امت کی اصلاح کے لئے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کیا۔ ان کا اسلوب اردو کے ممتاز اسالیب میں سے ہے اور انہوں نے اپنے اسلوب میں استدلال کو خاص جگہ دی ہے ان کے انداز نظر میں دلائل اور براہین اصل ہیں جس کا اثر پڑھنے والے پر ہوتا ہے مولانا کے تراجم پر ان کے اسلوب کی چھاپ لگی ہے اور ان کا ترجمہ قرآن دوسرے تراجم سے بالکل مختلف ہے مولانا نے اس طرح ترجمہ میں اردو محاوروں اور ہندوستانی تعبیروں کے ذریعہ اپنے ترجمہ میں

وضاحت اور سلاست پیدا کی ہے۔اس ترجمہ کو ہندوستان میں اور پاکستان میں بھی بڑی مقبولیت حاصل ہے اور اس کے آٹھ دس ایڈیشن نکل چکے ہیں اور مقبول ہو چکے ہیں۔مقبولیت کے لحاظ سے یہ ترجمہ عصر جدید کا سب سے مقبول ترجمہ ہے اور تفہیم القرآن اس دور کی ایک عمدہ تفسیر ہے۔اور مکمل ہے۔

ہر لحظہ جمال خود نوع دگر آرائی
شعورو دگرانگیزی شوق دگر افزائی

ترجمۂ قرآن مجید از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔

(۲) ایضاً ص ۷

(۳) ایضاً ص ۷

(۴) ایضاً ص ۹

(۵) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ مؤلفہ محمد یسین مظہر صدیقی مطبوعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی فروری ۲۰۰۱ء ص ۲۴

مولانا صباح اسماعیل (ندوی، علیگ)
مہتمم باب العلوم، کلکتہ ۱۴

سمیع اللہ اسد کا ''قرآن منظوم''

منظوم تراجم کے باب میں ایک ناپسندیدہ اضافہ

سورہ بقرہ کی روشنی میں

قرآن مجید رب کائنات کی کتاب ہے۔اللہ جل سبحانہ، نے اپنے اس کلام عظیم کو اپنے نبی آخرالزماں، تاجدار انبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر اپنے برگزیدہ نمائندے روح القدس حضرت جبرائیل امین کے ذریعہ نازل فرمایا ہے۔پچھلی تمام شریعتوں کو منسوخ کرنے والی اور دین اسلام کو مکمل صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرنے والی یہ کتاب قیامت تک کے انسانوں کے لئے ہادی ورہنما ہے، اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری انسانوں کے عاجز وناقص کاندھوں پر ڈالنے کے بجائے خود اپنے اوپر لیا ہے۔اللہ کے جو بندے اس کتاب ہدایت سے جڑتے اور اس کی خدمت واطاعت کرتے ہیں اللہ ان کی حفاظت وکفایت فرماتا ہے اور جو لوگ اس سے بغاوت وعداوت کرتے ہیں اللہ ان کو ذلیل وخوار کرتا ہے۔اس کتاب الٰہی کی خدمت ایک بڑی سعادت اور اس کا پیغام اللہ

کے بندوں تک پہنچانا مبارک عبادت ہے اسی لئے نزول قرآن کے پہلے روز ہی سے اللہ کے نیک بندوں نے اس راہ میں سعادت مندانہ دوڑ لگائی ہے اور اس کی خدمت وتبلیغ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔

اللہ کے آخری نبی حضرت محمد عربی قیامت تک کے تمام انسانوں کے آخری رہنما اور ان پر نازل ہونی والی کتاب قرآن مجید قیامت تک کے نبی نوع انسان کے لئے دائمی اور واحد کتاب ہدایت ہے اسی لئے اللہ قادر مطلق نے دنیا کی ہر اہم زبان میں اس کا ترجمہ کروادیا ہے کہ قیامت کے دن عربی زبان سے ناواقف کوئی شخص یہ نہ کہے کہ اس کے پاس خدائی پیغام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح اردو میں بھی جو اس وقت مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کی زبان ہے، اللہ تعالیٰ نے بہت سارے لوگوں کو اس بات کی توفیق دی ہے کہ وہ اس زبان کے جاننے اور سمجھنے والوں کے لئے عام فہم اور آسان ترجمہ کرسکیں۔ بعض سعادت مندوں نے قرآن مجید کا ترجمہ منظوم شکل میں بھی کیا ہے اور یقیناً اس سے ان کا مقصد ترجمہ کو خوبصورت بنانا اور قارئین کے لئے اسے زیادہ دلچسپ بنا دینا تھا تاکہ بعض لوگ اس کی ادبی لذت وحلاوت کا مزہ لیتے ہوئے اسے جلد سے جلد، زیادہ سے زیادہ اور بار بار پڑھ لے جائیں اور اس کے اندر موجود انوار ہدایت سے اپنی زندگی کے تاریک گوشوں کو منور کرسکیں۔

فی الوقت ہمارا موضوع شہر کلکتہ کے ایک سابق پروفیسر سمیع اللہ اسد صاحب کا ''قرآن منظوم'' ہے جس کے ذریعہ انہوں نے عوام کے سامنے قرآن مجید کا اردو میں منظوم ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، مگر اس سے پہلے کہ ہم ان کے منظوم ترجمے پر کوئی تبصرہ کریں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ محض کوئی ادبی کتاب نہیں

ہے جس کی خوبی یا خرابی پر کوئی تبصرہ ضروری نہیں ہوتا۔ خالص ادبی کتابوں پر بھی زبان وادب کے ارباب تبصرہ کرنے سے نہیں چوکتے، یہ تو قرآن مجید کا ترجمہ ہے۔ اگر کوئی اس میں دانستہ یا نادانستہ بھول چوک کرے تو قرآن مجید سے تعلق رکھنے والوں کے لئے لازمی ہوجاتا ہے کہ وہ اس کی خامیوں کی نشاندہی کریں اور عوام وخواص سب کے سامنے اس کی خوبی وخرابی کو واضح کریں۔ پھر اس کے بعد یہ بھی ضروری ہوجاتا ہے کہ اس کی غلطیوں کی اصلاح کی جائے اگرچہ وہ کتنی ہی معمولی اور کم کیوں نہ ہوں۔ میں کلکتہ اور قرآن کی نسبت سے اپنا فرض سمجھتا تھا کہ جہاں تک ہوسکے میں اس پر غائرانہ نظر ڈال کر کم از کم یہ دیکھنے کی کوشش کروں کہ اس منظوم ترجمے میں کوئی نقص تو نہیں ہے۔ اس کتاب کی پہلی جلد سورہ فاتحہ تا سورہ نساء پر مشتمل ہے، دوسری جلد سورہ مائدہ تا سورہ توبہ پر اور تیسری جلد سورہ یونس تا سورہ کہف پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد شائع ہوچکی ہے مگر باقاعدہ جاری نہیں ہوئی ہے جب کہ تیسری جلد بھی عنقریب منظر عام پر آنے والی ہے اور آگے بھی کام جاری ہے۔ اس کتاب کا بغور مطالعہ صاف لفظوں میں یہ واضح کرتا ہے کہ قرآن مجید کے ترجمے میں پروفیسر صاحب کو جس سنجیدگی کا مظاہرہ کرنا چاہئے تھا، انہوں نے نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ مشہور مسلمان شاعر اور اردو کے معروف ادیب ونقاد پروفیسر مظفر حنفی صاحب نے جنہوں نے شہر کلکتہ میں ایک طویل عرصہ گزارا ہے اور اس شہر سے مرزا غالبؔ کی طرح عقیدت رکھتے ہیں، اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''یہ کلام اللہ کے ساتھ کلام سمیع اللہ بھی ہے۔''

سمیع اللہ اسدؔ صاحب کی کتاب ''قرآن منظوم'' کی خامیاں اس لئے بھی زیادہ سنگین ہوجاتی ہیں کہ انہوں نے اپنی کتاب کے شروع میں ہی یہ وضاحت

کردی ہے کہ ان کا ترجمہ بس ترجمہ ہے، تفسیر نہیں ہے جس کا سیدھا مطلب یہی ہے کہ اس کتاب میں جو بھی بات ہے وہ اللہ جل شانہ، ہی کی ہے، ان کی نہیں ہے مگر وہ اپنے ترجمے کے دوران بار بار اس سے بھٹکتے اور ترجمہ کے ساتھ تفسیر کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ سمیع اللہ اسد صاحب اپنی اس کتاب میں ''پیش لفظ کے تحت لکھتے ہیں'' قرآن کریم کے مکمل منظوم ترجموں کی تعداد صرف چار ہیں:

زادالآخرت (۱۸۲۸)، نظم البیان (۱۹۲۳)، افصح الکلام (۱۹۲۵) اور وحی منظوم (۱۹۴۶) جزوی منظوم ترجمے صرف سحر البیان (۱۹۵۱)، آب رواں (۱۹۶۰) مفہوم القرآن (۱۹۷۳) اور منظوم ترجمۂ قرآن ہیں۔ ان کے علاوہ اول چہارم، انتیسویں، تیسویں پاروں اور چند سورتوں کا منظوم ترجمہ بار بار ہوا ہے مگر یہ سارے ترجمے تفسیری ہیں، لفظی نہیں۔ اکثر نثری (لفظی) ترجمے زبان و بیان کے لحاظ سے ناقص اور معانی کی تفہیم کے اعتبار سے مبہم ہیں۔''

اس کے بعد وضاحت کرتے ہیں کہ ''یہ ترجمہ صرف اصل معانی قرآن کی حدود میں مقید ہے۔ معانی قرآن کی اصل روح کو برقرار رکھنے کے لئے ان میں حک و اضافہ اور بیجا تفسیروں سے گریز کیا گیا ہے۔'' شاعر موصوف کا یہ دعویٰ صرف دعویٰ ہی ہے۔ ان کا منظوم ترجمۂ قرآن بار بار ان کے اس دعوے کو جھٹلاتا ہے (مثالیں آگے آرہی ہیں) جہاں تک بات مذکورہ کتاب کی ادبی اور فنی حیثیت کی ہے تو شاعر کو خود اس کے نقص اور بے وزنی کا اعتراف ہے۔ وہ اپنے پیش لفظ میں صاف لکھتے ہیں ''ارباب شعر و ادب سے معذرت خواہ ہوں کہ بعض مقامات پر قوافی کی فنی پابندی میرے لئے مشکل تھی۔'' اور یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف ہر اس شخص کو ضرور کرنا پڑے گا جو اللہ رب العالمین کی عظیم کتاب قرآن مجید کا منظوم

ترجمہ کرنے کی کوشش کرے گا اور وہ بھی اس دعوے کے ساتھ کہ اس کا ترجمہ تفسیری نہیں، لفظی ہے اور صرف اصل معانی قرآن کی حدود میں مقید ہے۔ اس مقالہ سے میرا مقصود بس یہی ہے کہ میں قرآن منظوم کی اصل صورت کو دنیا کے سامنے واضح کردوں تاکہ اللہ کے نیک اور سیدھے بندے غلطی سے اس کتاب اور صاحب کتاب کی غلطیوں کو اللہ غنی وحمید کی طرف منسوب نہ کریں۔

قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیر میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں مترجم کو اپنی طرف سے کسی بھی قسم کے حذف واضافہ کی اجازت نہیں ہے۔ مترجم کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنے ترجمہ میں بس اتنا ہی کہے جتنا اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ نہ ایک لفظ کو کم کرے نہ ایک لفظ کا اضافہ کرے جب کہ ثانی الذکر میں مفسر وشارح اپنی رائے پیش کرسکتا ہے مگر چند شرائط کے ساتھ۔ قرآن مجید کی تفسیر کے مآخذ طے ہیں اور مفسر کو اس سے روگردانی کی اجازت حاصل نہیں ہے۔ کسی بھی شارح کی کوئی ایسی بات جو قرآن مجید ہی کی صریح باتوں کی نفی کرنے والی ہو یا احادیث صحیحہ کے خلاف جاتی ہو یا ان تمام اقوال کو یکسر مسترد کر دینے والی ہو جو اب تک کے مفسرین کرام کی قرآن وحدیث کی روشنی میں متفقہ تحقیق ہو، ہرگز قابل اعتنا نہیں بلکہ لائق انکار ہے۔ اور 'قرآن منظوم' چونکہ محض ترجمہ ہے اور مترجم نے اس کا اعلان بھی کیا ہے کہ وہ خالص ترجمہ پیش کررہا ہے اس لئے اس میں اگر کہیں بھی کمی بیشی ہوگی تو وہ قابل مؤاخذہ ہوگی۔ یہ مؤاخذہ اس لئے اور بھی اہم ہوجاتا ہے کہ اس کتاب میں قرآن مجید کی اصل عبارت موجود نہیں ہے۔ اس کتاب کا قاری صرف ترجمہ پر ہی انحصار کرتا ہے اور جو کچھ بھی پڑھا جاتا ہے اسی کو اللہ کا اصل کلام تصور کرتا ہے۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے آیئے اب ہم یہ

دیکھیں کہ سمیع اللہ اسدؔ کا 'قرآن منظوم' کیوں منظوم تراجم کے باب میں ''ایک ناپسندیدہ اضافہ'' ہے۔

جہاں تک بات اس کتاب میں خامیوں اور غلطیوں کی ہے تو یہ کتاب ان ناپسندیدہ اشیاء سے بھری ہوئی ہے۔قرآن مجید کے ترجمے میں ایک آدھ غلطی بھی ناقابل برداشت ہوتی ہے مگر یہ حقیقت حیرت انگیز ہے کہ صرف سورہ بقرہ میں تین سو سے زائد جگہیں ایسی ہیں جہاں اس ناچیز کو نشان لگانا پڑا ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اس مقالہ کو صرف سورہ بقرہ تک محدود رکھا ہے۔سورہ بقرہ ہی کی تمام غلطیوں کی نشاندہی ایک مقالہ میں مشکل ہے چہ جائیکہ پوری کتاب کی خامیوں کا احاطہ ممکن ہو۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کی یہ غلطیاں کس قسم کی ہیں تو یہ وضاحت بھی چونکانے والی ہے کہ ترجمے کہ غلطیوں کی جتنی بھی قسمیں ہوسکتی ہیں لگ بھگ سبھی اس میں موجود ہیں اضافہ کی غلطیاں،حذف کی غلطیاں،معنی ومراد کی غلطیاں،ترجمے کی غلطیاں،پروف کی غلطیاں،زبان کی غلطیاں،بیان کی غلطیاں، چھوٹی غلطیاں اور بڑی غلطیاں۔

اضافے

اب آیئے ہم ان غلطیوں پر ذرا تفصیلی نظر ڈالیں اور سب سے پہلے ترجمے میں ان اضافوں پر نظر ڈالیں جو مترجم نے اپنی طرف سے کردئے ہیں۔مترجم نے اس دعوے کے باوجود کہ انہوں نے حک واضافہ سے گریز کیا ہے جگہ جگہ اضافہ سے کام لیا ہے۔یہ کچھ ایسے اضافوں کی مثالیں ہیں جہاں معنی ومفہوم تبدیل تو نہیں ہوتا مگر جو بہر حال مترجم کا اضافہ ہے۔یہاں بہر حال اس بات کی وضاحت ضروری

ہے کہ عام طور پر مترجمین اس طرح کا اضافہ کرتے ہیں مگر وہ اپنی بات کو قوسین Breacket کے اندر لکھتے ہیں۔ سمیع اللہ اسد صاحب بھی بسا اوقات قوسین کا استعمال کرتے ہیں مگر وہ ضرورت کے باوجود ایسا پانچ فیصدی جگہوں پر بھی نہیں کرتے۔ بطور نمونہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

یہاں میں نے اصل عبارت کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا ترجمہ بطور نمونہ سامنے رکھا ہے اور اضافے والی عبارتوں کو قوسین میں بند کر دیا ہے۔ ان مثالوں میں شاعر کے ترجمے کی غلطی بھی ہو سکتی ہے لیکن یہاں فی الحال اضافہ دکھایا جا رہا ہے۔

اصل عبارت	اصل ترجمہ	آیت	منظوم ترجمہ
بما کانوا یفسقون	اس سبب سے کہ وہ نافرمانی کرتے رہے تھے	۵۹	چرخ سے ان فاسقوں کے واسطے (سرکشوں اور ظالموں کے واسطے)
وما اللہ بغافل عماتعملون	اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو، اللہ اس سے بے خبر نہیں	۷۴	(گو کہ تم رب کی طرف مائل نہیں) وہ مگر تم لوگوں سے غافل نہیں
إن کنتم مؤمنین	اگر تم واقعی ایمان والے تھے	۹۱	ہو اگر مومن (تو ایسا جہل کیوں)
فول وجهك شطر المسجد الحرام	اچھا اب کر لیجئے اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف	۱۴۴	پھیر لے اب بیت کعبہ کی طرف اپنے چہرے کو (بصد شوق وشغف)
وقاتلوا فی سبیل الله	اور اللہ کی راہ میں قتال کرو	۲۴۴	(رب نے تم سے یہ کہا اے مسلمو!) تم خدا کی راہ میں لڑتے رہو

وإیای فارھبون	اور تم صرف مجھی سے ڈرو	۴۰	(ماسوا مجھ سے کسی سے مت ڈرو) مجھ سے ہی تم لوگ ڈرتے رہو

ہم یہ مانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ شعر کی اپنی کچھ مجبوریاں ہیں۔منظوم ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔بحور واوزان کا لحاظ اور ردیف وقافیہ کا خیال بسا اوقات انسان کو ناپسندیدہ مجبوریوں کی طرف دھکیل دیتا ہے مگر ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ان کی وجہ سے قرآن کے ترجمہ میں تبدیلی کردی جائے یا ایسے الفاظ کا اضافہ کردیا جائے جس سے معنی ومفہوم بدل جائے۔ردیف وقافیہ کی مجبوریاں ملاحظہ ہوں۔

وللکٰفرین عذاب مھین	اور کافروں کے لئے عذاب ذلت والا ہے	۹۰	واسطے ان کافروں کے (اب شتاب) رب کی جانب سے ہے سوا کن عذاب
وإذجعلنا البیت مثابةللناس وامنا!	اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے خانہ کعبہ) کو لوگوں کے لئے ایک مقام رجوع اور مقام امن مقرر کیا	۱۲۵	ایک گھر ہم نے بنایا (لاجواب) لوگوں کی خاطر، پئے امن وثواب

اب وہ اضافے ملاحظہ ہوں جن کی اجازت ایک مترجم محض کو نہیں دی جاسکتی

ولا ھم ینصرون	اور نہ انہیں مدد ہی پہنچ سکے گی	۴۸	(عاجز ومجبور ہوں گے نیک وبد) کچھ نہیں دی جائے گی ان کو مدد

ثم عفونا عنكم من بعد ذلك — پھر ہم نے تم کو اس کے بعد بھی معاف کردیا — ۵۱ ہم نے تم لوگوں کی توبہ کی قبول (تا کہ آئندہ نہ ہو پھر کوئی بھول)

ولقد جآءكم موسىٰ بالبينٰت — اور موسیٰ تمہارے پاس کھلے ہوئے نشان لے کر آیا — ۹۲ موسیٰ لے کے آئے تھے واضح نشان (کس لئے ان سے ہوئے تم بدگماں)

وإله آبائك إبراهيم وإسمٰعيل وإسحٰق إلهاواحدا — اور آپ کی باپ دادوں ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی — ۱۳۳ ہے وہی (یعقوب) واسمٰعیل کا حضرت اسحاق، (ان کی جیل) کا

وكذلك جعلناكم أمته وسطا — اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک امت عادل بنایا ہے — ۱۴۳ (ہم نے ان پر فوقیت دی ہے تمہیں)

بل أحياءٌ — بلکہ وہ زندہ ہیں — ۱۵۴ بلکہ وہ زندہ ہیں (اور ہیں باشعور)

وبشر الصابرين — اور آپ صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیجئے — ۱۵۵ دیں بشارت صابروں کو اے نبی! (صابروں پر ہے نظر اللہ کی)

صم بكم عمى — (یہ) لوگ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں — ۱۷۱ (جانور ہیں) گونگے، بہرے، کور چشم

أعلم أن الله على كل شئى قدير — میں یقین رکھتا ہوں کہ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے — ۲۵۹ ''ہے خدا ہر چیز پر قادر، قدیر (جاں مری ہے اس کے قبضے میں اسیر)

اب کچھ ایسے اضافے دیکھئے جو عجیب اور نا قابل قبول ہیں۔

فيه ظلمات — اس میں اندھیرے ہیں — ۱۹ جس میں ہوں ظلمات (اندھیری رات ہو)

ولا تعثوا فی الأرض	اور زمین پر فسادی بن	۶۰	(ہو گیا محفوظ تم سب کا مفاد)
مفسدین	کرمت پھرو		اب نہ پھیلاؤ زمیں پر تم فساد
أن أكون من الجاهلين	کہ میں جاہلوں میں	۶۷	جاہلوں میں (بڑا جاہل) بنوں ہو جاؤں
يهلك الحرث	کہ کھیتی تلف کرے	۲۰۵	کھیتی غارت کرتا ہے (مثل جراد)
من بعد موسیٰ	موسیٰ کے بعد	۲۴۶	گزرا تھا جو واقعہ موسیٰ کے بعد (کیا تمہیں ہے وہ زمانہ اب بھی یاد)
قال	(نبی نے) کہا	۲۴۷	ان سے بولے پھر نبی (ہو کے غضب)
ولا شفاعة	اور نہ سفارش	۲۵۴	اور نہ اس دن کچھ سفارش (کی سعی)
والله يهدى القوم الظلمين	اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ ہدایت نہیں دکھاتا	۲۵۸	(اس لئے) اللہ رب العالمین ظالموں کی راہبری کرتا نہیں

اس ترجمۂ قرآن میں بعض ایسی مثالیں بھی ہیں جہاں مترجم نے اپنے اضافہ سے مفہوم ہی بدل دیا ہے۔

الذين خرجوا من ديارهم	جو اپنے گھروں سے نکل گئے تھے	۲۴۳	(راہ حق میں چھوڑے) جن لوگوں نے گھر

یہاں جن لوگوں کی وجہ سے نکلنے کا ذکر ہو رہا ہے وہ اللہ کے حکم کے مطابق

اللہ کی راہ میں گھروں سے نہیں نکلے تھے بلکہ موت کے ڈر سے حکم الٰہی سے فرار ہوتے ہوئے نکلے تھے۔قرآن کی اسی آیت میں یہ صراحت موجود ہے کہ جب وہ اس طرح فرار ہونے لگے تو اللہ نے انہیں موت سے دوچار کر کے یہ دکھا دیا کہ موت سے بھاگنا موت سے بچنے کے مرادف نہیں ہے، پھر انہیں زندگی بھی بخش دی تا کہ وہ شکر گزار بنیں۔

أیا ما معدودات والفتنتہ (یہ روزے) گنتی کے چند ۸۱۴ روزے گنتی میں مقرر کردہ

أشد من القتل روز کے (ہیں) ہیں

فتنہ تو قتل سے (بھی) سخت تر ۱۹۱ فتنہ ہو (یا ہو کوئی ونگا

ہے فساد) قتل وخوں سے یہ

ہے مہلک اور زیاد

کہیں مترجم نے ایسا اضافہ کیا ہے جس سے معنی میں بعد پیدا ہو گیا ہے اور وہ بلاغت جو اللہ کے کلام میں موجود ہے غائب ہو گئی ہے۔''اللہ کی مدد آخر کب آئے گی؟'' کے جواب میں اللہ حکیم وعلیم نے فوراً یہ جملہ ارشاد فرمایا ہے کہ''سن رکھو! اللہ کی امداد یقیناً قریب ہی ہے'' مگر شاعر صاحب درمیان میں ایک مصرعے کا اضافہ فرما دیتے ہیں کہ''اس طرح رب نے دیا ان کو جواب'' (۲۱۴) یہ اضافہ کہاں چوٹ پہنچاتا ہے اور قرآن کی روح کو کیسے مجروح کرتا ہے اس کا اندازہ تو بس وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو زبان وادب کے رمز آشنا بھی ہیں اور قرآن مجید کی ادبی وفنی بلاغت کے قدر دان بھی۔قرآنی آیات کا اضافوں سے بھرا ہوا یہ بے تکا ترجمہ آیت ۱۱۷ میں بھی ادب کے اعلیٰ ترین نمونہ قرآن مجید کے اس ترجمے پر بے تحاشا رنج پہنچاتا ہے۔

فإنما يقول له،كن تو بس اتنا ہی اس سے کہتا ہے ۱۱۷ (دوحروف) 'کن' اسے کہتا ہے

فيكون (کہ) ہوجا بس وہ ہوجاتا ہے وہ (ایک پل میں پیدا) ہوجاتا وہ

حذف

قرآن مجید کے ترجمے کے وقت تفسیر وتوضیح کی شکل میں قوسین کے اندر مناسب اضافہ کی گنجائش تو موجود ہوسکتی ہے لیکن الفاظ یا جملے حذف اور غائب کردینے کی ذرہ برابر گنجائش نہیں ہے مگر اس کے باوجود نہایت حیرت کے ساتھ یہ واضح کرنا پڑتا ہے کہ صرف سورہ بقرہ میں ایسی بہت ساری مثالیں موجود ہیں جہاں مترجم نے جانے انجانے میں الفاظ اور جملے حذف کردیے ہیں۔

شمار	عبارت	آیت	ترجمہ
(۱)	من الصواعق	۱۹	کڑک کے سبب
(۲)	وأتوابه متشابها	۲۵	اور انہیں وہ (واقعی دیا ہی جائے گا ملتا جلتا ہوا
(۳)	أول	۴۱	اولین
(۴)	لقومه	۶۰	اپنی قوم کے لئے
(۵)	اعوذ بالله	۶۷	خدا مجھے اس سے پناہ میں رکھے (ایسی گر حرکت کروں)
(۶)	بإذن الله		اللہ کے حکم سے
(۷)	وما هم بضارين به من	۹۷	حالانکہ وہ (فی الواقع) کسی کو بھی اس کے

أحدالابإذن الله	۱۰۲	ذریعہ سے نقصان نہ پہنچا سکتے مگر ہاں ارادۂ الٰہی سے
(۸) نصیر	۱۲۰	مددگار
(۹) للناس	۱۲۴	لوگوں کا
(۱۰) الکتب	۱۲۹	کتاب (الٰہی)
(۱۱) إبراهيم	۱۳۳	ابراہیم
(۱۲) يا أيها الذين آمنوا	۱۵۳	اے ایمان والو!
(۱۳) تواب	۱۶۰	بڑا توبہ قبول کرنے والا
(۱۴) نبيين	۱۷۷	نبیوں
(۱۵) علىٰ حبه	۱۷۷	اس کی محبت
(۱۶) والموفون بعهد هم	۱۷۷	اور اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے
(۱۷) والضر آء	۱۷۷	اور بیماری میں
(۱۸) ولكتبر وا الله	۱۸۵	اور یہ کہ تم اللہ کی بڑائی کیا کرو
(۱۹) اكبر عندالله	۲۱۷	کہیں بڑے (جرم) اللہ کے نزدیک
(۲۰) وتشاور	۲۳۳	اور مشورے سے
(۲۱) من معروف	۱۴۰	شرافت کے ساتھ
(۲۲) على الناس	۲۴۳	انسانوں پر
(۳۳) بإذن الله	۲۴۹	اللہ کے حکم سے
(۲۴) ولكن الله ذوفضل على العلمين	۲۵۱	لیکن اللہ تو جہان والوں پر بڑا فضل رکھنے والا ہے

(۲۵)لذی کفر	۲۵۸	جو کافر تھا
(۲۶)إلیٰ اجل مسمی	۲۸۲	کسی مدت معین تک
(۲۷)ممن ترضون من الشهداء	۲۸۲	ان گواہوں میں سے جنہیں تم پسند کرتے ہو
(۲۸)إلیٰ اجله	۲۸۲	اس کی میعاد تک
(۲۹)إن نسینا	۲۸۶	اگر ہم بھول جائیں

تبدیلیاں

اب آیئے ہم ایسی مثالوں پر نظر کرتے ہیں جن میں ہمیں مترجم کی جانب سے کی گئی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں بھی مختلف اقسام کی ہیں۔ الفاظ میں تبدیلیاں، اسماء کی تبدیلیاں، ضمائر کی تبدیلیاں، تراجم کی تبدیلیاں، مفاہیم کی تبدیلیاں، ترتیب کی تبدیلیاں اور جملوں کی ساخت کی تبدیلیاں۔

الفاظ اور اسماء کی چند تبدیلیاں

ہدیٰ	۲	کتاب
زوج	۳۵	حوا
بنی اسرائیل	۴۰، ۴۷،	قوم یہود
بحر (سمندر)	۵۰	دریا
جبریل	۹۷	قاصد
المسجد الحرام	۱۴۴	بیعت کعبہ
رسول	۱۵۱	نبی

حرام کیا گیا	۱۷۳	جائز نہیں
فی القتلیٰ (مقتولوں کے باب میں)	۱۷۸	قاتلوں کی شان میں
المشعر الحرام	۱۹۸	مزدلفہ
بنی اسرائیل	۲۱۱	آل ہود
اثم (گناہ)	۲۱۹	نقصان
لا تحل (حلال نہیں)	۲۲۹	لازم نہیں
وصیت	۲۴۰	انتظام
عیسی ابن مریم	۲۵۳	ابن مریم

الفاظ واسماء کی طرح مترجم نے جگہ جگہ (اپنی شعری مجبوریوں کے تحت) صیغوں اور ضمیروں کو بھی بدلا ہے اور خوب بدلا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

فبدل الذین ظلموا قولاً غیر الذی قیل لهم	مگر اس زیادتی کرنے والوں نے جو انہیں بتایا گیا تھا اس کے خلاف ایک اور کلمہ بدل ڈالا	۵۹	ظالموں کو ہم نے سکھلائی تھی جو انہوں نے الٹا دیا اس بات کو
تحمله الملئکه	اس (صندوق) کو فرشتے لے آئے گے	۲۴۸	تھے فرشتے اس کو ہاتھوں میں لئے
منهم من کلم الله	ان میں وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا	۲۵۳	کوئی تو ہم سے ہوا محو کلام

جملوں کی ساخت اور ہیئت کی تبدیلیاں دیکھیں۔

أولئك يلعنهم الله	یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ ان پر	۱۵۹	ایسے لوگوں پر خدا کی مار ہو اور

ویلعنهم اللعنون	لعنت کرتا ہے اوران پر لعنت کرنیوالے لعنت کرتے ہیں		ملامت کرنے والوں کی بھی مار
أولئك عليهم لعنة الله والملئكه والناس أجمعين	یہی وہ لوگ ہیں کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی، اور فرشتوں کی اور آدمیوں کی سب کی	۱۶۱	ان پہ ہو اللہ کی لعنت مدام اور ملائک اور بشر کا بھی ملام
ومن يبدل نعمته من بعد ماجاء ته	اللہ اور جو کوئی اللہ کی نعمت کو بدل ڈالے بعد اس کے کہ وہ اس کو پہنچ چکی ہو	۲۱۱	پا کے فضل رب بدل ڈالا انہیں

یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مقدس میں ناموں اور کاموں کے ذکر کے وقت جس ترتیب کو پسند فرماتے ہے وہ مناسب بھی ہیں اور اہم بھی۔مگر جیسا کہ عین ممکن تھا ضرورت شعری نے مترجم کو اس کا لحاظ والتزام کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔اور اس قسم کی بے ترتیبیوں سے یہ کتاب بھری ہوئی ہے۔

ترتیب الھیٰ	آیت	ترتیب مترجم
مومنین، یہود، نصاریٰ، صابئین	۶۲	صابی، نصرانی، یہود و مومنین
اللہ، ملائکہ، رسل، جبریل، میکال	۹۸	کون ہے مولا فرشتوں کا عدو قاصد و میکال، نبیوں کا عدو
ہماری طرف، ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، اسباط، موسیٰ و عیسیٰ کی طرف	۱۳۶	ہم ہوں، ابراہیم ہوں یا موسیٰ ہوں انبیاء اسحٰق ہوں یا عیسیٰ ہوں یا ہوں اسمٰعیل یا یعقوب ہوں یا خدا کے خاص اک محبوب ہوں

مترجم کی دانستہ تبدیلیوں کا ذکر اس کڑوے سچ کے ساتھ کرتا ہوں کہ اس کتاب کے مترجم کو صرف ترجمے سے مطلب ہے، اس سے اس کو کوئی مطلب نہیں ہے کہ ترجمہ درست ہوتا ہے یا غلط۔ وہ اپنی گاڑی مسلسل آگے بڑھاتے رہنے اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے کی کوشش میں یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے کہ وہ کیا کیا روندتے جا رہے ہیں۔ جملے بدلتے ہیں تو بدل جائیں، مفہوم بدلتے ہیں تو بدل جائیں۔ الفاظ، ضمائر اور تراکیب کو بے دردی سے کچلتے ہوئے وہ ان جگہوں پہ بھی تبدیلی کرتے چلے جاتے ہیں جہاں وہ آسانی کے ساتھ صحیح الفاظ استعمال کر سکتے تھے۔ مثال ملاحظہ ہو۔

آیت ۲۵۷ کی عبارت "یخرجهم من الظلمٰت إلی النور" (انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے) کا ترجمہ وہ اس طرح کرتے ہیں۔ لاتا ہے وہ تیرگی سے سوئے نور اللہ رب کائنات نے یہاں ظلمات استعمال کیا ہے اور ظلمات (تاریکیوں) کو ہمیشہ جمع ہی استعمال کیا ہے جب کہ نور (روشنی) کو واحد۔ اور یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ تاریکیاں بے شمار ہیں اور نور بس ایک ہی ہے۔ اللہ نور السمٰوات والأرض کا نور۔ مترجم یہاں ظلمت استعمال کر سکتے تھے بلکہ انہوں نے آیت ۱۹ میں اسے استعمال بھی کیا ہے لیکن وہ یہاں اپنی عادت کے مطابق چوک گئے اور ظلمات کی جگہ تیرگی استعمال کر کے یہ بھی واضح کر دیا کہ قرآن کے الفاظ و معانی سے ان کا دور کا رشتہ بھی نہیں ہے۔ یہ غلطی انہوں نے ایک ہی آیت میں دو مرتبہ کی ہے۔ وہ یہاں "الذین کفروا أولیاؤهم الطاغوت یخرجونهم من النور إلی الظلمٰت" (اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے ساتھی شیطان ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے

ہیں) کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں۔

کفر رب جن لوگوں کی کرتوت ہے
ایسے لوگوں کا ولی طاغوت ہے
لاتا ہے ان کو اندھیرے کی طرف
روشنی سے کرکے محروم وتلف

یہاں وہ بہت آسانی کے ساتھ یہ لکھ سکتے تھے کہ ایسے لوگوں کے ولی طاغوت ہیں لاتے ہیں ان کو اندھیروں کی طرف

غلط ترجمے

ترجمہ ایک سنجیدہ عمل ہے اور قرآن کا ترجمہ سب سے زیادہ سنجیدگی کا متقاضی ہے۔ایک مترجم قرآن جب غلطیاں کرتا ہے تو وہ غلطیاں انتہائی خطرناک اور ناقابل برداشت ہوتی ہیں کیونکہ عام قاری کی نظر میں جو قرآن کی زبان اور اس کے بیان سے ناواقف ہوتا ہے یہ غلطیاں مترجم کی نہیں، خود قرآن مجید کی ٹھہر جاتی ہیں۔اس کے باوجود ''قرآن منظوم'' ترجمے کی بے شمار خامیوں سے بھری ہوئی ہے۔آیئے سب سے پہلے ان ترجموں پر نظر ڈالیں جنہیں ہم دور کا اور مرادی ترجمہ سمجھ سکتے ہیں۔

أولئك هم الخسرون	تو بس یہی لوگ ہیں نقصان اٹھانے والے	۲۷	ان کو عقبی میں نہیں کوئی مفاد
واركعوامع الراكعين	اور (نماز) جھکنے والوں کے ساتھ جھکتے رہو	۴۳	پھر جھکو تم جھکنے والوں کی صفات

قال أتستبدلون الذی هو خیر	(موسیٰ نے) کہا تو کیا جو چیز ادنیٰ ہے تم اسے لینا چاہتے ہو اس چیز کے مقابلہ میں جو بہتر ہے	۶۱	بولے موسیٰ پھر "تمہیں ہے گر عزیز ایسی نعمت کی جگہ بیکار چیز
فإن الله شاکر علیم	سو اللہ تو بڑا قدر دان ہے، بڑا علم رکھنے والا ہے	۱۵۸	نیکیاں لکھتا ہے مولا اسکے نام ہے علیم و دانا، بینا رب کی ذات
والله سریع الحساب	اور اللہ حساب بہت جلد لے لے گا	۲۰۲	چکتا کردے گا خدا ان کا حساب
وأن تعفوا أقرب للتقویٰ	اور اگر تم (اپنا حق) معاف کردو تو یہ بہت ہی قرین تقویٰ ہے	۲۳۷	تم بھی ایسا ہی کرو نرمی کا کام تا کہ تم سب متقی ہو، لاکلام
فقال لهم الله موتوا، ثم أحیاهم	تو اللہ نے ان سے کہا کہ مرجاؤ، پھر اس نے انہیں جلادیا	۲۴۳	ان کو جب مرنے کو مولا نے کہا مر گئے پر ان کو زندہ کیا
وآتاه الملك والحکمة	اور اللہ نے داؤد کو بادشاہت اور دانائی عطا کی	۲۵۱	سطوت و حکمت ملی داؤد کو تھی پسند ان کی صفت معبود کو
والله واسع علیم	اللہ بڑا وسعت والا ہے، بڑا علم والا ہے	۲۶۱	ہے جہاں میں ہر طرف پھیلا ہوا اس کے فضل اور نعمتوں کا دائرہ

وإن تفعلوافانه فسوق بکم	اوراگر (ایسا) کروگے تو تمہارے حق میں ایک گناہ (شمار) ہوگا	یہ ۲۸۲	ایسا کرنے سے تمہیں ہوگا الم

اب کچھ ایسے ترجمے ملاحظہ کریں جنہیں عجیب اور بے تکا ترجمہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

اللہ یستھزی بھم	انہیں اللہ بنا رہا ہے اور وہ انہیں	۱۵	جب ٹھٹھولی ان سے کرتا ہے خدا ہوتے ہیں
ویمدھم فی طغیانھم یعمھون	ڈھیل دے رہا ہے (تو) وہ اپنی سرکشی میں سرگردان ہو رہے ہیں		وہ سرکشی میں مبتلا اور ڈوبے رہتے ہیں اس میں سدا
یضل بہ کیثراً	گمراہ بھی کرتا ہے بہتوں کو	۲۶	اس سے تو گمراہ ہو جاتے ہیں لوگ اور
ویھدی کیثراً	اسی سے اور راہ بھی دکھاتا ہے بہتوں کو اسی سے		بہت سے راہ پر آتے ہیں لوگ
أفلا تعقلون	سو کیا تم عقل سے کام (ہی) نہیں لیتے؟	۴۴	کیا سمجھتے بھی ہو یہ قرآن تم؟
بل لعنھم اللہ بکفرھم	(نہیں) بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کر رکھی ہے ان کے کفر کے باعث	۸۸	بلکہ ان میں کفر تھا گوشہ نشیں
واقیموا الصلوٰۃ	اور نماز کی پابندی رکھو	۱۱۰	تم پڑھو سیدھے کھڑے ہو کر صلوٰۃ
واذابتلیٰ إبرھیم ربہ، بکلمت	اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ابراہیم کو ان کے پروردگار نے چند امور میں آزمایا	۱۲۴	کر کے رب نے اپنا اظہار خیال رکھا ابراہیم کو مشکل میں ڈال

إن اللـــــه مـــع بیشک اللہ صبر کرنے والوں ۱۵۳ صبر کرنے والے ہیں جو لوگ بھی رہتا
الصابرین کے ساتھ ہے ہے اللہ اس کے ساتھ ہی

فلا جناح علیه أن اس پر (ذرا بھی) گناہ ۱۵۸ اس پہ لازم ہے کرے اس کا طواف ہے
یطوف بهما نہیں کہ ان دونوں کے نہیں اس میں گناہ وانحراف
درمیان آمد ورفت کرے

واصلحو اوبینوا اور درست ہوجائیں اور ۱۶۰ جو سدھر کر حق کا چرچا کرتے ہیں
ظاہر کردیں

یحبو نهم کحب ان سے ایسی محبت رکھتے ۱۶۵ ان کو کرنا چاہئے تھا رب سے پیار پر وہ
الله ہیں جیسی اللہ سے (رکھنا کرتے ہیں بت اخرب سے پیار
چاہئے)

الشهـــر الـــحـــرام حرمت والا مہینہ تو ۱۹۴ ماہ حرمت کے لئے ماہ حرام محترم ماہ دگر
بالشهر الحرام حرمت والے مہینہ کے بھی لاکلام
عوض میں ہوتا ہے

زیـن لـلـذین کفروا خوشنما کردی گئی ہے دنیوی ۲۱۲ ان کی ہوجاتی ہے دنیا خوشگوار کرتے ہیں
الحیوة الدنیا زندگی ان لوگوں کی نظر جو کفر کی راہ اختیار
میں جو کافر ہیں

کذلك یبین الله لکم اللہ اسی طرح تمہارے لئے ۲۴۲ کر دیا واضح خدا نے ہر کلام لوخردمند
ایته لعلکم تعقلون کھول کر اپنے احکام بیان سمجھداری سے کام
کرتا ہے شاید کہ تم سمجھو

والله یقبض اور اللہ ہی تنگی بھی کرتا ہے ۲۴۵ زیادہ کرتا ہے گھٹا بھی سکتا ہے

ویبسط اور فراخی بھی کرتا ہے

اب ہم ان ترجموں پر نظر ڈالتے ہیں جو سرے سے درست ترجمہ قرار دئے جانے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ ایسے غلط ترجموں کی ڈھیر ساری مثالیں موجود ہیں مگر ہم یہاں صرف چند اور اہم اغلاط کی نشاندہی کر رہے ہیں۔

یخاعون اللہ	دھوکہ دینا چاہتے ہیں اللہ کو اور	۹	جھونکتی رہتی ہیں یہ قوم جھول
والذین آمنوا	ایمان والوں کو		مومن اللہ کی آنکھوں میں دھول
واللہ محیط بالکفرین	حالانکہ اللہ گھیرے ہوئے ہیں	۱۹	چار سو گھیرے ہو جب قہر خدا
	کافروں کو		
فازلھما الشیطن	پھر شیطان نے دونوں کو	۳۶	وسوسے نے لڑکھڑایا دونوں کو
عنھا	پھسلایا اسی درخت کے باعث		
فاقتلو اانفسکم	پھر اپنے اشخاص کو قتل کیا	۵۴	مار ڈالو اپنے اپنے نفس کو
واذاخذنا میثاقکم	اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم	۶۳	طور پر ہم تم سبھوں کو لے گئے
ورفعنا فوقکم الطور	نے تم سے عہد لیا اور اور ہم		عہد و پیماں تم سے ہم نے یہ
خذوا ماآتینکم بقوۃ	نے تمہارے اوپر (کوہ) طور کو		لئے جو دیا ہم نے تمہیں تھامے
واذکروامافیہ	بلند کیا مضبوطی کے ساتھ اسط		رہو نام حق تم اپنے لب پر بھی
	(کتاب) کو پکڑ رکھو جو ہم		رکھو
	نے تم کو دی ہے اور جو کچھ اس		
	میں ہے اسے یاد رکھو		
وان منھا لما یھبط	اور کوئی ان میں سے ایسا بھی	۷۴	ڈوبتا ہے کوئی پتھر زیر آب خوف
من خشیۃ اللہ	ہوتا ہے کہ اللہ کی ہیبت سے		رب اور بار عصیاں سے شتاب

	نیچے آگرتا ہے		
ام تقولون علی اللہ مالا تعلمون	یا (یوں ہی) اللہ پر وہ جوڑ رہے ہو جس کا علم تم نہیں رکھتے	۸۰	کہتے ہو تم رب کے بارے میں جو بات کافرو! اس کا نہیں تم کو گولیات
افسکلما جاءکم رسول بما لاتھوی انفسکم	تو کیا جب کوئی پیمبر تمہارے پاس ان (احکام) کے ساتھ آیا جو تمہارے نفس کو نہ بھائے	۸۷	جب کبھی تم میں کوئی آیا نبی جس کے آنے کی تمہیں چاہت نہ تھی
قل بئسما یا مرکم بہ ایمانکم ان کنتم مؤمنین	آپ کہہ دیجئے (کیسی) بری ہے وہ بات جس کا حکم تمہارا ایمان تمہیں دے رہا ہے، اگر تم (واقعی) ایمان والے ہو	۹۳	کہہ خدا کہتا ہے ان کے بارے میں یہ کہ ہے ایمان تمہارا خراب کاش تم ایمان لے آتے شتاب
وماھو بمزجزحہ من العذاب ان یعمر	حالانکہ اگر اتنی عمر وہ پا بھی جائے تو (امر) اسے عذاب سے تو نہیں بچا سکتا	۹۶	بچ نہیں سکتے ہیں لیکن قبر سے
مایودالذین کفرامن اھل الکتب والا المشرکین ان نیزل علیکم من خیر من ربکم	جو لوگ کافر ہیں (خواہ) اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے وہ اسے (ذرا بھی) پسند نہیں کرتے کہ تمہارے اوپر کوئی بھی بھلائی تمہارے پروردگار کی طرف	۱۰۵	برخلاف مشرک واہل کتاب حسرت کافر ہے تم پر ہو عتاب اور نہ ہو فضل خدا تم لوگوں پر ہے مگر رب کی عطا تم لوگوں پر

			سے اتر کر رہے
وھم یتلون الکتب	درآنحالیکہ وہ سب (ایک ہی) کتاب (آسمانی) پڑھتے ہیں	۱۱۳	گرچہ وہ دونوں یہ دعویٰ کرتے ہیں "ہم کتاب اک ہی خدا کی پڑھتے ہیں"
اولئك ماكان لهم ان يدخلوها الاخائفين	یہ لوگ اس لائق ہی نہیں کہ ان میں داخل ہو مگر ہاں یہ کہ ڈرتے ہوئے	۱۱۴	اس میں جانے کا نہیں ان کو جواز ڈر سے جاتے ہیں وہاں فتنہ طراز
ان طهرا بيتي للطائفين والعاكفين والركع السجود	کہ تم دونوں میرے گھر کو پاک صاف رکھو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے	۱۲۵	رکھیں اس گھر کو ہمیشہ پاک وصاف تا کریں زائر مرے گھر کا طواف یہ رکوع وسجدہ کی ہے بارگاہ لوگ لیتے ہیں یہاں آکر پناہ
ومن كفر فامتعه قليلا	کہ جو کفر کرے گا میں اسے بھی کچھ دن مزہ اٹھانے دوں گا	۱۲۶	پھر کہا رب نے "جو ہیں اہل ضلم میں انہیں دوں گا متاع عیش کم"
ومن يرغب عن ملة ابراهيم الامن سفه نفسه	اور ابراہیم کے مذہب سے کون پھرے گا مگر وہی جس نے اپنے کو احمق بنالیا ہو	۱۲۹	دین ابراہیم سے جو پھر گیا اس نے اپنے آپ کو رسوا کیا
ان الله اصطفىٰ لكم الدين	بیشک اللہ نے تمہارے لئے دین کا انتخاب فرمایا ہے	۱۳۲	رب نے تم کو اور تمہارے دین کو چن لیا ہے آخرت کے واسطے

فسیکفیکھم الله	سواب اللہ آپ کی طرف سے ان کے مقابلہ میں ہے	۱۳۷	آپ کافی ہیں مسلماں کے لئے
وما جعلنا القبلة التی کنت علیها الالنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علیٰ عقبیه	اور جس قبلہ پر آپ (اب تک) تھے اسے ہم نے تو اسی لئے رکھا تھا کہ ہم پہچان لیں الٹے پاؤں واپس چلے جانے والوں سے	۱۴۳	ہم نے یہ قبلہ کیا تجھ کو پسند جس پہ رہنا ہے تجھے اب کاربند تا کہ ہم جانیں کہ تیرا کون ہے تابع اور منہ پھیر لیتا کون ہے
وان کانت لکبیرة الاعلی الذین هدی الله	اور یہ (حکم) بہت گراں ہے، مگر ان لوگوں کو نہیں، جنہیں اللہ نے راہ دکھادی ہے	۱۴۳	کر کے ہم نے یہ تغیر ایک بڑا اہل ایماں کو دیا قبلہ نیا
وما بعضهم بتابع قبلة بعض	اور نہ وہ (آپس میں) ایک دوسرے کے قبلہ کو ماننے والے ہیں	۱۴۵	بیشک ان میں اور تجھ میں کوئی ہے نہیں کرتا کسی کی پیروی
الحق من ربك فلاتکونن من الممترین	حق ہے تیرے پروردگار کی طرف سے، پس تو کہیں شک کرنے والوں میں ہرگز نہ ہوجانا	۱۴۷	حق تو ہے رب کی طرف سے اک عطا اس میں کچھ شک نہیں ہے شائبہ
ولکل وجهة هو مولیها	اور ہر ایک کے لئے کوئی رخ ہوتا ہے جدھر وہ متوجہ رہتا ہے	۱۴۸	جس کسی کی ہوتی ہے منزل جدھر پھیر دیتا ہے خدا اس کو ادھر

لئلایکون للناس علیکم حجة	تا کہ لوگوں کو تمہارے مقابلے میں حجت نہ رہ جائے	۱۵۰	تا نہو تم لوگوں کے اندر کبھی کوئی گنجائش نہ قیل وقال کی
وتقطعت بهم الاسباب	اوران کے باہمی تعلقات ٹوٹ کر رہ جائیں گے	۱۶۶	توڑ دیں گے ان سے سارے رابطے
اولوکان آباءهم لایعقلون شیئا ولا یهتدون	خواہ ان کے باپ (دادا) نہ ذرا عقل بھی رکھتے ہوں اور نہ ہدایت رکھتے ہوں	۱۷۰	لیکن ان کے آباء تو نادان تھے راہ حق سے سر بسر انجان تھے
واذاتولی	اور جب پیٹھ پھیر جاتا ہے	۲۰۵	راہ حق سے وہ الگ ہو جاتا ہے
فالئك حبطت اعمالهم فی الدنیا والآخرة	تو یہی وہ لوگ ہیں کہ ان کے اعمال دنیا اور آخرت میں میں اکارت گئے	۲۱۷	ہوں گے ان کے کام ان کے روبرو گھیرے یہ ان کو رہیں گے چارسو
فبلغن اجلهن	اور اپنی مدت گزرنے پر پہنچ جائیں	۲۳۱	جب وہ پوری کرلیں میعاد فراق
والوالدات یرضعن اولادهن حولین کاملین	اور مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں پورے دو سال	۲۳۳	ماؤں پر لازم ہے یہ، وہ دو برس اپنے بیٹوں کو پلائیں دودھ بس
لمن اراد ان یتم الرضاعة	(یہ مدت) اس کے لئے ہے جو رضاعت کی تکمیل کرنا چاہے	۲۳۳	باپ گر یہ چاہتا ہے شوق سے بچہ اس کا دودھ پینا چھوڑ دے
وعلی المولود له رزقهن وکسوتهن	اور جس کا بچہ ہے، اس کے ذمہ ہے ان (ماؤں) کا کھانا	۲۳۳	پھر تو واجب ہے کہ اپنے بچے کو کپڑے دے اور نیز کھانا

	اور کپڑا		کھانے کو
لاتضار والدة بولدها نہ کسی	ماں کو تکلیف پہنچائی	۲۳۳	ماں کو پہنچانا نہیں جاتا ضرر بچے
ولا مولود له، بولده	جائے اس کے بچہ کے باعث		کی نگرانی اس پر ہے مگر
	اور نہ کسی باپ ہی کو تکلیف		
	پہنچائی جائے اس کے بچہ کے		
	باعث		
فان خفتم فرجالاً	لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو تو تم	۲۳۹	خواہ تم ہو پاپیادہ یا سوار دشمنوں
اور کباناً	پیدل ہی (پڑھ لیا کرو) یا		سے تم نہ ڈرنا زینہار
	سواری پر		
قدتبین الرشدمن	ہدایت تو گمراہی سے صاف	۲۵۶	رشد ہے اک نور، گمراہی نہیں
الغی	صاف کھل چکی ہے		
لبثت یوما اوبعض	میں رہا (اس حالت	۲۵۹	بولا وہ "اک روز اور اک ثانیہ"
یوم	میں) کوئی دن بھر یا اس کا کچھ		
	حصہ		
ایوداحدکم	کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا	۲۶۶	چاہتا ہے ہر کوئی اس کے یہاں
	ہے		
ان الله غنی حمید	کہ اللہ بے نیاز ہے، ستودہ	۲۶۷	ہے خدا حمد و ثنا سے بے نیاز
	صفات ہے		
الذین احصروا فی	جو اللہ کی راہ میں گھر گئے ہیں	۲۷۳	دین کے کاموں سے وہ معذور
سبیل الله			ہیں

واشھد واذابتا یعتم اور جب خرید وفروخت کرتے ۲۸۲ قرض کی جب بات ہو رکھ لو گواہ ہو (تب بھی) گواہ کرلیا کرو

حاضرین!

ان اغلاط کی موجودگی میں ''قرآن منظوم'' کا مطالعہ ہمیں اس حیرت انگیز حقیقت سے آشنا کراتا ہے کہ مترجم نہ عربی زبان سے کما حقہ، واقفیت رکھتے ہیں اور نہ ہی علوم قرآنیہ سے ان کو کوئی نسبت ہے۔اس کے باوجود قرآن کے ترجمے کو منظوم شکل میں پیش کرنے کا جو نتیجہ نکل سکتا تھا وہی اس کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے آیا ہے، مگر مترجم اس سے کہیں زیادہ جری نظر آتے ہیں جب وہ حاشیوں میں خالص اپنی رائے پیش کرتے ہیں اور یہ بسا اوقات ایسی ہوتی ہیں کہ ان پر سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔یہاں ہم چند ایسی مثالیں پیش کرنا چاہتے ہیں جو اس سچائی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

نرالی تشریحیں

مثال۔۱ آیت۔۲ کے تحت 'ازواج مطہرۃ' کا ترجمہ 'پاک میووں' کرنے کے بعد حاشیہ میں لکھتے ہیں: ''پاک میوے: یہ ترجمہ ہے 'ازواج مطہرۃ' کا۔ازواج جمع ہے زوج کی، جس کا معنی ہے ''جوڑا''۔میاں بیوی کے جوڑے کو زوج کہتے ہیں اس لئے عام مترجمین قرآن نے ازواج مطہرۃ کا ترجمہ ''پاک بیویاں'' کیا ہے۔مگر مجھ کو اس سے اختلاف ہے'' اس کے بعد انہوں نے وہاں تین وجہیں بتائی ہیں جو ان کی نگاہ میں ان کے خیال کو تقویت پہنچاتی ہیں۔نیز یہ بھی کہتے ہیں کہ ''پھر جنت میں بیویوں کی کیا ضرورت ہے۔افزائش نسل کے لئے دنیا میں بیویوں کی

ضرورت ہوتی ہے۔اسی باہمی مشاجرت کے جرم میں آدم وحوا جنت سے نکالے گئے تھے'' اور یہ بھی کہ ''قرآن کی زبان میں 'زوج' یا 'زواج' کے الفاظ ثمرات ونباتات کے ساتھ مختص ہیں۔'' ان کی یہ رائے میری سمجھ سے باہر ہے اس لئے کہ اب تک جتنے بھی مستند شارحین ومفسرین قرآن ہوئے ہیں انہوں نے شاید ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔میں تو اس نرالی تفسیر پر یہی تبصرہ کرسکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ یسین میں جنتیوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔"إن أصحاب الجنة اليوم فى شغل افكهون هم وأزواجهم فى ظللٍ على ألأرائك متكئون لهم فيها فاكهة ولهم مايدعون" (اہل جنت بیشک اس روز اپنے مشغلہ میں خوش دل ہوں گے۔وہ اور ان کی بیویاں سایوں میں مسہریوں پر تکیہ لگائے بیٹھی ہوں گی۔ان کے لئے وہاں میوے ہوں گے اور ان کے لئے وہ (سب کچھ) ہوگا جو کچھ وہ مانگیں گے۔آیت ۵۵۔۵۷) پتہ نہیں سمیع اللہ اسد نے قرآن کی یہ آیتیں دیکھی بھی ہیں یا نہیں۔

مثال ۲۔ آیت۔۳۵ کے تحت ''شجرۃ'' کا ترجمہ 'شجر کرنے کے بعد حاشیہ میں تحریر کرتے ہیں ''شجر: درخت، پیڑ۔شجر سے مراد ہے مشاجرت یعنی باہم مباشرت اور مرد وعورت کا جنسی اختلاط''۔مترجم کی یہ رائے ان کی نادانی کی دلیل بھی فراہم کرتی ہے اور ان کی بے ایمانی کی بھی۔نادانی یہ کہ 'مشاجرت' کے معنی کسی بھی لغت میں باہم مباشرت اور جنسی اختلاط کے نہیں پائے جاتے ہیں۔'مشاجرت' اردو میں مستعمل ہی نہیں ہے۔یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور عربی میں اس کے معنی 'جھگڑا کرنے' کے ہیں، یا پھر 'الماشیۃ' کے ساتھ جانوروں کو درخت چرانے یا درخت کے پتوں پر گزارہ کرنے کے ہیں۔اور جہاں تک بات بے ایمانی کی ہے تو وہ مثال

ا۔اس کی موجودگی میں بالکل صاف ہے جہاں انہوں نے یہ تحریر کیا ہے ''اسی باہمی مشاجرت کے جرم میں آدم وحوا جنت سے نکالے گئے تھے۔'' یہ درخت خود انہوں نے لگایا ہے اور اسے پانی بھی وہی فراہم کررہے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ مترجم نے اشجار کی پیوندکاری کے عمل Grafting سے یہ لفظ مشاجرت تیار کرلیا ہے پھر اسی کی بنیاد پر وہ حضرت آدمؑ اور ان کی زوجہ محترمہ کے اخراج کی وجہ مباشرت کو قرار دیتے ہیں۔دراصل مترجم ''یعنی'' کہہ کر ہر مرتبہ خود کو بھی مطمئن کرلیتے ہیں اور دوسروں سے بھی یہی امید کرتے ہیں مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ 'یعنی' کے ذریعہ وضاحت کی بھی اپنی کچھ شرطیں ہیں جن کا التزام بے حد ضروری ہے۔ان کے اس سمجھنے سمجھانے کو سمجھنا ہو تو آیت ۵۰ کے تحت حاشیہ۔۲ دیکھئے جہاں وہ ''بحر'' ترجمہ 'دریا' لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں ''دریا: یعنی بحر قلزم:۔آیت ۱۰۹ کے تحت نظم میں ''کفار'' استعمال کرنے کے بعد وضاحت کرتے ہیں ''یہاں کفار کی جگہ قرآن شریف میں اہل کتاب استعمال ہوا ہے''۔اور آیت ۱۲۰ کے تحت ''جب تک ان کی۔۔۔'' لکھنے کے بعد وضاحت کرتے ہیں۔''جب تک ان کی: جب تک وہ آپ کی''۔

مثال۔۳ آیت ۴۹ کے تحت "یذبحون أبناء کم" (جو تمہارے بچوں کو قتل کر ڈالتے تھے) کا ترجمہ نظم کرنے کے بعد اس پر حاشیہ چڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں ''حضرت موسیٰ کے مژدۂ بعثت پر فرعون نے یہ حکم نافذ کردیا تھا کہ اسرائیلیوں کے یہاں نومولود تمام بچوں کو قتل کردیا جائے اور بچیوں کو زندہ درگور کردیا جائے۔'' قرآن مجید اسی آیت کریمہ میں اس کا انکار کرتا ہے "ویستحیون نساء کم" (اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے)۔قرآن مجید کی طرح توریت بھی یہی

کہتا ہے کہ فرعون بنی اسرائیل کے لڑکوں کو مار رہا تھا اور لڑکیوں کو زندہ رکھ رہا تھا۔''اگر بیٹا ہو تو اسے ہلاک کردو اور اگر بیٹی ہو تو اسے جینے دو۔۔۔ان میں جو بیٹا پیدا ہوا سے تم دریا میں ڈال دو اور جو بیٹی ہو، جیتی رہنے دو'' (خروج۔۱،۱۵، ۲۲) ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب مترجم یہ حاشیہ لگا رہے تھے اس وقت ان کے دل ودماغ پر زمانۂ جاہلیت کا وہ منظر چھایا ہوا تھا جہاں بیٹیوں کو زندہ درگور کیا جارہا تھا اور اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرمارہا تھا" وإذا الموء ودة سئلت. بای ذنب قتلت" (اور جب زندہ دفن کی ہوئی (لڑکی) سے سوال کیا جائے کہ وہ کس گناہ پر قتل کی گئی تھی) ۸،۹ سورۃ التکویر۔ یہاں حیرت در حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اس حاشیہ کے فوراً بعد انہوں نے جو دوسرا حاشیہ چڑھایا ہے اس میں وہ یہ تحریر فرماتے ہیں۔ ''فرعون نے عورتوں کو زندہ چھوڑ دیا مگر ان سے کاشتکاری وغیرہ کا کام لیتا اور طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتا''۔یا تو ہم اسے مترجم کے بیان کا تضاد سمجھیں یا پھر ذرا رک کر''لڑکیوں'' اور''عورتوں'' کا فرق سمجھتے ہوئے نئے زاویہ سے غور وفکر کریں۔

مثال۔۴ آیت۔۱۲۶ کے تحت" وارزق اهله، من الثمرات" کا ترجمہ اے خدا ان کو کھلا میٹھے ثمر کرنے کے بعد حاشیہ میں لکھتے ہیں 'ثمر سے مراد یہاں امن وامان ہے۔'' اسے ہم سراسر زبردستی کی مثال کہہ سکتے ہیں۔کہیں تو یہ 'أزواج مطهرة' کا ترجمہ، پاک میوے، کرتے ہیں اور کہیں ثمرات، کا مطلب 'امن وامان' بتاتے ہیں درآنحالیکہ اسی آیت کی ابتدا میں حضرت ابراہیمؑ صاف لفظوں میں امن وامان کے قیام کی دعا بھی کر چکے ہیں۔''جو بھی چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے''۔

مثال۔۵ آیت۔۱۴۴ کے تحت جو تحویل قبلہ کی آیت ہے، حاشیہ میں تحریر کرتے ہیں'' ۔۔۔یہاں رسول کی کیفیت کا ذکر ہے۔تحویل قبلہ سے پہلے وہ بیت المقدس

کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھتے تھے مگر ان کو یہ گوارہ نہیں تھا۔۔۔'' یہاں بس ایک لفظ ''گوارہ'' پر غور کرنا ہے۔کیا واقعی ایسا تھا؟ رسول اکرم ﷺ اور ان کے اصحاب کرامؓ کی یہ خواہش ضرور تھی کہ وہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نمازیں ادا کریں اور یہ بھی اس لئے تھا کہ خود اللہ تعالیٰ نے (وإذ جعلنا البيت مثابة للناس کے ذریعہ) یہ ارشاد فرما دیا تھا اور تحویل قبلہ کا حکم نازل ہونے ہی والا تھا مگر یہ کہنا کہ حضور کو بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا گوارہ نہیں تھا بڑی عجیب، خطرناک اور ناپسندیدہ بات ہے درآنحالیکہ اس وقت تک یہی اللہ تعالیٰ کا حکم تھا۔

مثال۔۶ آیت۔۲۰۶ کے تحت "ولبئس المهاد" (اور بری سے بری آرام گاہ ہے) کا ترجمہ ہے یہ بستر اس کے سونے کے لئے نظم کرنے کے بعد حاشیہ میں لکھتے ہیں۔''انگریزی میں ایک کہاوت: ''As you had made your bed,So you must lie on it'' (اپنے لئے تم نے جو بستر تیار کیا ہے تم کو اسی پر سونا ہوگا)'' اس غیر ضروری حاشیہ کے ذریعہ آپ اپنے قارئین پر نہ صرف اپنی انگریزی دانی کا سکہ جمانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ خواہ مخواہ اللہ رب کائنات کی بات کی تائید ایک عام آدمی کے قول سے کرانا چاہتے ہیں۔یہ ان کی سطحی ذہنیت کی عجیب مثال ہے۔

مثال۔۷ آیت۔۲۲۸ کے تحت "يتربصن بأنفسهن ثلاثة قروء" (اپنے کو تین میعادوں تک روکے رہیں) کا ترجمہ تین مہ تک چاہئے پھر انتظار کرنے کے بعد حاشیہ میں تحریر کرتے ہیں ''تین مہ: عدت کی یہ مدت غیر حاملہ عورتوں کے لئے ہے جو تین حیض کے بعد اپنے سابق شوہر سے رجوع زوجیت کر سکتی ہیں''۔یہ حاشیہ بھی دیگر حاشیوں کی طرح مختلف سوالات قائم کرتا ہے۔اول تو ترجمے میں ''تین مہ'' والی بات ہی غلط ہے۔عدت کے مدت تین ماہ جن کے لئے

ہے ان کے تعلق سے اللہ رب العالمین فرماتا ہے "والتی یئسن من المحیض من نسائکم ان ارتبتم فعد تھن ثلاثۃ اشھر والی م نحضن" (اور تمہاری مطلقہ بیویوں میں سے جو حیض آنے سے مایوس ہو چکی ہیں اگر تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہیں اور (اسی طرح) ان کی بھی جنہیں ابھی حیض نہیں آیا) یہ درست ہے کہ حاملہ عورت کی عدت کی مدت ولادت کے کنیز شرعی، نابالغہ اور غیر ملموس عورتوں کے احکام بھی تو اس باب میں مختلف ہیں۔اسی کے ساتھ یہاں یہ جملہ چومکانے والا ہے "جو تین حیض کے بعد اپنے حیض اپنے سابق شوہر سے رجوع زوجیت کر سکتی ہیں۔" اگر یہ غیر حاملہ عورت طلاق رجعی ہے تو اس کو اپنے سابق شوہر کے پاس واپس جانے کے لئے خاص مدت کے انتظار کی ضرورت نہیں ہے اور اگر یہ غیر حاملہ مطلقہ عورت طلاق مغلظہ گزار رہی ہے تو بھی وہ تین معیادوں کے بعد اپنے سابق شوہر سے رجوع نہیں کر سکتی ہے۔اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا سمجھتے ہیں اور کیا سمجھاتے ہیں۔یہاں ان کے حاشیے سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ بیان ان طلاق یافتہ عورتوں کے لئے تعلق سے ہے جنہیں دوسری مرتبہ طلاق مغلظہ ملی ہے اور جو اپنے شوہر اول کے پاس واپسی کا انتظار کر رہی ہیں۔

مثال۔۸ آیت۔۲۴۱ کے تحت "وللمطلقٰت متاع بالمعروف" (اور طلاقتوں کے حق میں بھی نفع پہنچانا دستور کے موافق مقرر ہے) کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں مل گئی جن عورتوں کو ہے طلاق مت کرو سامان سے تم ان کو عاق پھر حاشیہ چڑھاتے ہیں "سامان: اس سے مراد ہے سامان جہیز اور تحفے تحائف جو شادی کے موقعے پر دیئے جاتے ہیں۔" اللہ رب العالمین یہاں پرہیزگاروں کو یہ حکم دے رہا ہے کہ جن

عورتوں کو تم طلاق دے دو انہیں فی الفور دھکے دیکر باہر مت نکال دو، جس کی عزت واحترام اور تحفے تحائف کے ساتھ بیاہ کر لائے تھے اسے احترام واہتمام کے ساتھ اسے واپس کرو بلکہ بوقت ضرورت انھیں کچھ دنوں تک اپنے گھر ہی میں رکھو اور اس کی ضرورتوں کی تکمیل کرو۔ قرآن مجید کے اس حکم کی مناسبت سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنی مستند تفسیر میں فرماتے ہیں "فقہاء نے حدیث وسنت کی روشنی میں ایک سہ ماہی کی مدت مقرر کی ہے کہ اتنی مدت تک کھانے پہننے اور رہنے سہنے کا انتظام شوہر پر واجب ہے، مطلقہ پر اگر تینوں طلاقیں ابھی نہیں پڑی ہیں، جب تو یہ حکم متفق علیہ ہے اور اگر پڑھ چکی ہیں تو حنفیہ کے ہاں جب بھی یہی حکم ہے۔" اب اگر مترجم کے اس حاشیہ پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ مطلقہ کو سامان آسایش فراہم کرنے کے بجائے اسے واپس کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ ہاں اگر وہ اپنا کچھ لے کر آئی ہے تو اسے بھی واپس لے جاسکتی ہے۔ ان کے نزدیک م،متقیوں پر بس اتنا ہی فرض ہے۔

مثال۔۹ آیت۔۲۴۳ کے تحت "فقال لهم الله موتو اثم احیا هم" (تو اللہ نے ان سے کہا کہ مرجاؤ، پھر اس نے انہیں جلا دیا) کا ترجمہ اس طرح نظم کرنے کے بعد ان کو جب مرنے کو مولا نے کہا مر گئے پر ان کو پھر زندہ کیا وہ حاشیہ میں رقم طراز ہوتے ہیں "ان کو پھر زندہ کیا: یعنی خدا نے ان کو شہادت کا درجہ دیا، اور شہداء کبھی مرتے نہیں۔" مترجم حسب سابق اس حاشیہ کے ذریعہ بھی خود اپنی کہی بات سے مکرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو صاف فرمایا ہے کہ موت سے بھاگنے والے اس جم غفیر کو اللہ تعالیٰ نے خود بطور سزا موت دی تھی مگر پھر انہیں واپس زندگی بھی دے دی تھی تا کہ وہ یہ سوچنا چھوڑ دیں کہ موت سے بھی بھاگا جا سکتا ہے

اور پورے اخلاص کے ساتھ حکم الٰہی کی تعمیل میں لگ جائیں۔مترجم نے اس کا ترجمہ تو ''پھر زندہ کیا'' کردیا مگر چونکہ یہ بات ان کو ہضم نہیں ہورہی تھی اس لئے انہوں نے اپنا وہ حاشیہ چڑھانا ضروری سمجھا جو ان کی دانست میں بڑا عالمانہ اور فاضلانہ ہے نیز اچھے اچھوں کی چھٹی کردینے والا اور تفسیر قرآن کو ایک نیا رخ دینے والا ہے۔اگر اللہ نے یہ فرمادیا ہے کہ اس نے انہیں موت دی اور پھر زندہ کردیا تو ہمارا ایمان ہے کہ وہ ماردیے گئے پھر جلا دیے گئے۔جس اللہ نے انہیں پیدا کیا تھا اسی نے انہیں مارا بھی اور جلایا بھی، پھر وہی موت دینے والا اور دوبارہ زندہ کرنے والا ہے۔اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے۔

مثال۔۱۰ آیت۔۲۵۹ کے تحت ''قال انیٰ یحی ھذہ اللہ بعد موتھا'' (وہ کہنے لگا اللہ اس (آبادی) کو اس کے مرے پیچھے کیوں کر جلا اٹھائے گا) کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں پوچھا اس نے آپ سے، ''بعد ممات مولا ان کو کس طرح دیگا حیات؟'' اس کے بعد حاشیہ رقم کرتے ہیں۔''آپ سے: آپ سے مراد ہیں حضرت ابراہیمؑ۔'' یہ حاشیہ بھی حیرت انگیز ہے۔اس آیت کے واقعہ سے حضرت ابراہیمؑ کا دور کا رشتہ بھی نہیں ہے۔اس آیت میں جس گزرنے والے شخص کا ذکر ہے ان کے تعلق سے اکثر مفسرین کا خیال یہ ہے کہ وہ حضرت عزیز ہیں جن کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کا ہے۔حضرت علیؑ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی رائے بھی یہی ہے۔حضرت باقرؑ کے مطابق یہ حضرت یرمیاہ نبی ہیں جن کا زمانہ ساتویں صدی قبل مسیح کا ہے۔اور بائبل میں ایسا ہی ایک واقعہ حضرت حزقیل نبی کے تعلق سے پایا جاتا ہے جو چھٹی صدی قبل مسیح میں تھے۔حضرت ابراہیم بہر حال یہاں کہیں نہیں تھے۔ان کا زمانہ لگ بھگ دو ہزار قبل مسیح کا ہے۔اس کے باوجود اگر اسد صاحب

نے یہاں ابراہیمؑ کا نام نقل کردیا ہے تو اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس آیت سے پہلے اور بعد کی دونوں آیتیں سیدھے سیدھے حضرت ابراہیمؑ سے متعلق ہیں۔ یہ تو بس چند مثالیں ہیں، ورنہ شاعر نے بہت شعر اگائے ہیں۔

خطرناک غلطیاں:

اب اخیر میں مترجم کی چند غلطیاں ملاحظہ ہوں۔

قوت کے باوجود روزہ نہ رکھنے کی اجازت

وعلی الذین اور جو لوگ اسے مشکل سے برداشت ۱۸۴ روزے کے رکھنے کی قوت ہو

یطیقونه فدیة کرسکیں ان کے ذمہ فدیہ ہے جسے رکھے تو بہتر وگرنہ فدیہ دے

مترجم نے یہاں یطیقونہ، کا ترجمہ 'روزہ رکھنے کی قوت' کرکے نہ صرف ابن عباسؓ کی قرأت 'یطوقونہ' کو غلط ٹھہرادیا ہے بلکہ قوت کے باوجود روزہ نہ رکھنے اور فدیہ دے کر چھوٹ جانے کی اجازت بھی فراہم کردی ہے۔ اگر ان کا یہ ترجمہ درست تسلیم کرلیا جائے (جس کی پوری گنجائش موجود ہے) تو پھر اس آیت کو بعد والی آیت کی وجہ سے ابتدائے اسلام کا حکم مان کر منسوخ ماننا پڑتا ہے جس میں یہ صراحت ہے کہ "فمن شهد منكم الشهر فليصمه" (سو تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پائے، لازم ہے کہ وہ (مہینہ بھر) روزہ رکھے)۔ اور اس صورت میں جگہ جگہ حاشیہ چڑھانے والے مترجم کے لئے لازمی تھا کہ وہ حاشیہ میں اس کی صراحت کردیتے کہ یہ آیت منسوخ ہے یا حکم صرف شیخ فانی جیسے لوگوں کے لئے ہے اور یہی جمہور کا مذہب ہے، تاکہ غلط فہمی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

حالت روزہ میں مباشرت کی گنجائش

انکم کنتم تختانون کہ تم اپنے کو خیانت میں مبتلا کرتے ۱۸۷ تم خیانت کرتے تھے جس
انفسکم رہتے تھے مال سے

یہاں خیانت کی وضاحت کرتے ہوئے مترجم حاشیہ میں رقم طراز ہیں:
''تم خیانت۔۔۔روزے کی حالت میں دن میں کھانا پینا جائز نہیں اسی طرح دن میں مباشرت (بیوی کے ساتھ صحبت) بھی خدا کی عطا کردہ امانت (یعنی بیوی) کے ساتھ خیانت ہے''۔

اس کے معاً بعد مترجم کے یہ اشعار ہیں

تم سبھوں کی توبہ کو کرکے قبول
بخش دی ہے اس نے تم لوگوں کی بھول
اب تم اپنی بیویوں کے پاس جاؤ
ہے جو جائز اس سے لطف اندوز ہو

یہ اشعار اور حاشیہ ایک عام قاری کو یہی بتاتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ حالت روزہ میں بھی مباشرت کرلیا کرتے تھے، تو اللہ نے ان کی خیانت ان پر واضح کردی، پھر اسے معاف کرکے اس کی اجازت بھی فراہم کردی جب کہ حقیقت بالکل مختلف ہے۔ ابتدائے اسلام میں صحابہ کرام یہ سمجھتے تھے کہ ایام روزہ میں رات کے اوقات میں بھی بیویوں سے مباشرت کی گنجائش نہیں ہے یا شاید ناپسندیدہ ہے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہود کے یہاں روزوں کے دوران رات کے اوقات میں بھی مباشرت ممنوع تھی۔ بعض صحابہ نے ایسا کیا۔ یہ اللہ کی نظر میں غلط نہیں تھا مگر چونکہ ان کے

دل اس پر مطمئن نہیں تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو ان کی خیانت سے تعبیر فرمایا اور اپنے فضل وکرم سے اس کی بھی معافی کا علان فرما کر پوری طرح اس کی اجازت مرحمت فرمادی۔مگر سمیع اللہ صاحب نے جس طرح حاشیہ رقم کیا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو حالت روزہ میں بھی مباشرت کی اجازت دے رکھی ہے اور بیوی کے ساتھ مباشرت مفسدات صوم میں سے نہیں ہے۔نعوذ باللہ من ذلك

عورتیں کھیتیاں ہیں

نسائو کم حرث لکم تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں ۲۲۳ کھیتیاں ہیں یہ تمہاری عورتیں

اللہ علیم وحکیم نے یہاں دومرتبہ ''تمہاری'' ارشاد فرمایا ہے مگر مترجم نے صرف ایک مرتبہ 'تمہاری' استعمال کیا ہے۔اب اگر اس 'تمہاری' کو عورتوں کے ساتھ لگادیتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ 'تمہاری عورتیں کھیتیاں ہیں'۔اب جو بھی چاہے ان میں ہل چلائے تمہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اور اگر اس 'تمہاری' کو کھیتیوں کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نعوذ باللہ 'عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں'۔اور کسان پر کھیتی کے تعلق سے جو فرض بنتا ہے وہ سارے فرائض عام مردوں پر عام عورتوں کے تعلق سے قائم ہوجاتے ہیں نیز کوئی بھی آدمی کسی بھی کھیت میں ہل چلاسکتا ہے۔ع

حیران ہوں کہ روؤں یا پیٹوں جگر کو میں

مطلقہ کو عدت کے بعد بھی روک لینے کی اجازت

وإذا طلقتم النساء اور جب تم عورتوں کو طلاق مل گئی جن عورتوں کو ہے طلاق

فبلغن أجلهن	دے چکو اور وہ اپنی مدت	۲۳۱ جب وہ پوری کرلیں میعادفراق
فامسکوهن بمعروف	گزرنے پر پہنچ جائیں تو	روک لوگھر میں انہیں عزت
أوسر حوهن بمعروف	(اب یاتو) انہیں عزت کے	کے ساتھ یا کرو رخصت انہیں
	ساتھ روکے رکھو اور یا عزت	حرمت کے ساتھ
	کے ساتھ رہائی دے دو	

یہاں 'اذا' بعد کے لئے نہیں آیا ہے بلکہ ہمزمانی کے لئے آیا ہے لیکن مترجم یہاں اس کا ترجمہ بعد کرنے کے لئے کرتے ہیں۔اور بجائے 'مدت پوری کرنے پر پہنچ جائیں' کے 'میعادفراق پوری کرلیں' کہتے ہیں جس سے نہ صرف اس آیت کا مفہوم مشکوک ہوجاتا ہے بلکہ اس کے بعد والی آیت کا ترجمہ ومفہوم بھی گڈمڈ ہوجاتا ہے۔اور یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مطلقہ کو عدت کی مدت گزر جانے پر بھی طلاق بائن کی صورت میں بغیر نکاح جدید کے اور طلاق مغلظہ کی شکل میں بغیر دوسرے شوہر سے نکاح، طلاق، عدت کے بحیثیت بیوی روکے رکھنے کی گنجائش موجود ہے۔یہ شریعت اسلامی سے بڑا بھونڈا مذاق ہے۔

بیوہ کو زمانہ عدت میں اعلانیہ پیغام نکاح کا حکم

ولا جناح علیکم فیما	اور تم پر کوئی گناہ اس میں نہیں کہ تم	۲۳۵ گر ارادہ بیوہ سے شادی کا
عرضتم به من خطبة ان	(زیر عدت) عورتوں کے	ہو کردو ظاہر یا اسے دل
النساء أو أكننتم فی	پیغام نکاح کے باب میں کوئی بات	میں رکھو ہے نہیں اس میں
أنفسكم، علم الله	اشارتاً کہو یا (یہ ارادہ) اپنے دلوں	کوئی تم پر گناہ جانتا ہے
أنكم ستذكرونهن	ہی میں پوشیدہ رکھو، اللہ کو تو علم ہے	رب تمہارے دل کی چاہ
ولكن لاتواعدوهن	کہ ان عورتوں کا ذکر مذکور کروگے	ہاں، مگر خفیہ نہ رکھو اتلاف

سرا إلا أن تقولوا	البتہ ان سے کوئی وعدہ خفیہ (بھی)	اس کا تم اعلان کردو صاف
قولا معروفاً	نہ کرو مگر ہاں کوئی بات عزت و	صاف۔
	حرمت کے موافق (چاہو تو) کہہ	

دو

یہاں مترجم اپنی نادانی سے اللہ رب العالمین کے حکم کی صریح خلاف ورزی کررہے ہیں۔ اللہ حکیم ورحیم اپنے بندوں کو یہ صاف حکم دیتا ہے کہ وہ بیوہ عورتوں کو زمانۂ عدت میں نکاح کا پیغام ہرگز نہ دیں۔ وہ اشاروں کنایوں میں یہ ضرور ظاہر کرسکتے ہیں کہ وہ بعد عدت ان سے نکاح کا ارادہ رکھتے ہیں مگر صاف نکاح کا پیغام ان کی بیوگی اور عدت کی توہین ہے۔ شوہر سے جدائی کا غم معمولی نہیں ہوتا اور بیوی کے لئے اس کے فراق کے ابتدائی ایام نہایت کٹھن ہوتے ہیں۔ انہی تکلیفوں کے پیش نظر اللہ سبحانہ، وتعالیٰ یہ حکم دیتا ہے کہ اسے نکاح کا پیغام دے کر مزید دکھی مت کرو۔ ہوسکتا ہے وہ اس سے انکار ہی کردے اور شاید ایک اچھے رشتے سے محروم ہوجائے، مگر مترجم اس کے برعکس یہ رقم کرتے ہیں۔ ''اس کا تم اعلان کردو صاف صاف''۔ اللہ بچانا چاہتا ہے، شاعر پھنسانا چاہتا ہے۔

معروف کے بغیر بھی بیوہ عورت کو کچھ بھی کرنے دینے کا حکم

فإن خرجن فلا	لیکن اگر (خود) نکل جائیں تو ۲۴۰	اور جب خود ہی چلی جائے کہیں
جناح عليكم فيما	کوئی گناہ تم پر نہیں اس باب	اس کی ذمہ داری ہے تم پر نہیں کرتی
فعلن في أنفسهن	میں جسے وہ (بیویاں) اپنے	ہے وہ جو بھی اپنے طور پر (اس کا
من معروف		ذمہ کچھ نہیں ہے اور پر)

باب میں شرافت کے ساتھ
کریں

یہاں مترجم نے ''من معروف'' (شرافت کے ساتھ) کو حذف کردیا ہے اوران کی یہ غلطی ترجمے کونہایت خطرناک بنادیتی ہے۔اللہ خبیر وبصیر نے یہاں بیوہ کواپنے طور پر کچھ بھی کرنے کی اجازت ضرور عنایت کی ہے مگراس کے ساتھ یہ قید بھی لگادی ہے کہ اس کے اقدامات اسلامی شریعت اور انسانی اخلاق کے عین مطابق اور موافق ہوں۔ایسا نہ ہو کہ وہ فحاشی اور بے حیائی کا راستہ اختیار کرلے اور جو بھی چاہے کرتی پھرے مگر مترجم نے یہاں اس قید کو غائب کرکے بیوہ کو عام اجازت فراہم کردی ہے جو سراسر اسلامی اصول اور احکام کے خلاف ہے۔کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

ان اغلاط اور دیگر اغلاط کی روشنی میں جواس کتاب کے قاری کو بار بار حیرانی اور پریشانی میں ڈالتے ہیں، میں اس کتاب ''قرآن منظوم'' پر بس یہ تبصرہ کرسکتا ہوں کہ اگر یہ عربی سے اردو میں قرآن مجید کا ترجمہ ہے تو جب اس کتاب کا اردو سے عربی میں ترجمہ کیا جائے گا،ایک نیا قرآن وجود میں آئے گا۔اللہ ہماری حفاظت فرمائے!

غیر سنجیدگیوں کے مظاہرے

''قرآن منظوم'' کا ترجمہ ہمیں بار بار یہ احساس بھی دلاتا ہے کہ مترجم اپنے کام میں اتنے سنجیدہ نہیں ہیں جتنا ترجمۂ قرآن کا یہ کام ان سے مطالبہ کرتا ہے۔قرآن اللہ رب العالمین کا کلام اور دنیا کی سب سے اہم کتاب ہے لہٰذا اس

سے متعلق کام بھی سب سے زیادہ سنجیدگی اور توجہ کا مطالبہ کرتا ہے لیکن اس میں ڈھیر ساری مثالیں ایسی ہیں جو ان کی لا ابالی فطرت اور غیر سنجیدہ طبیعت کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔اس کتاب میں صرف کمپوزنگ اور پروف کی غلطیاں ہی نہیں ہیں زبان وبیان کی غلطیاں بھی ہیں۔غیر سنجیدگی کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

(۱) آیت ۲۶۰ میں ایک جگہ ایک مصرع کو دوبار لکھ دیا گیا ہے، یہاں پہلے مصرع میں وزن یا پروف کی غلطی بھی موجود ہے۔

اڑتی آئیں گی تیری آواز پر
اڑتی آئیں گی تیری آواز پر

(۲) آیت ۲۸۳ کے تحت اس شعر میں ردیف قابل توجہ ہے:

ہو اگر تم کو کسی پر اعتبار
رہن کردو اس کو اپنی جائداد

(۳) آیت ۵۵ کے تحت اس شعر میں شاعر کی زبان دانی ملاحظہ کیجئے۔وہ ''پیشوا'' کو جس کے معنی رہبر، رہنما اور امام کے آتے ہیں کس طرح استعمال کرتے ہیں۔(حضرت موسیٰؑ کی قوم ان سے مخاطب ہو کر کہتی ہے)

جب ترے اللہ کو دیکھیں گے ہم
تجھ کو اس کا پیشوا مانیں گے ہم

(۴) آیت ۸۵ کا آخری حصہ آیت کے تحت شامل نہیں ہے مگر آیت ۸۶ کے تحت جو آخری شعر موجود ہے وہ اس آیت کا حصہ نہیں ہے۔یہ دراصل آیت ۸۵ کا وہ حصہ ہے جو اپنی جگہ سے غائب ہے۔

کرتے ہو تم لوگ جو دنیا میں کام

باخبر ہے اس سے مولا لاکلام

(وما الله بغافل عماتعملون)

(۵) 'کبریا' اللہ تبارک وتعالیٰ کا صفاتی نام ہے اور شاعر نے بھی سورہ بقرہ میں ۹ مرتبہ اس کو اللہ ہی کے لئے استعمال کیا ہے لیکن ایک جگہ انہوں نے اس لفظ کو نبی کے لئے بھی استعمال کرلیا ہے۔ وہ آیت ۲۴۶ کے تحت "اذقالوالهم ابعث لنا ملكا نقاتل فى سبيل الله" (جب کہ ان لوگوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے ایک امیر مقرر کردیجئے کہ ہم خدا کی راہ میں قتال کریں) کا ترجمہ اس طرح نظم کرتے ہیں۔

انہوں نے اپنے پیمبر سے کہا "بھیج دے ایک بادشاہ اے کبریا تا کہ
کریں راہ خدا میں ہم جدال"

لفظ "اللہ" سورہ بقرہ میں ۲۷۲ مرتبہ استعمال ہوا ہے اور سچ مچ 'اللہ' کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ اللہ رب کائنات کا اسم ذاتی ہے اور اسم ذاتی کا ترجمہ اس کی خوبصورتی کو ختم کردیتا ہے مگر مترجم نے اس سورت میں صرف ۳۵ مرتبہ 'اللہ' استعمال کیا ہے۔ بلاشبہ ڈھیر ساری شعری مجبوریوں کے ساتھ (جو مترجم موصوف کے لئے کچھ زیادہ ہی بڑا مسئلہ ہے) اسے ہر جگہ استعمال کرنا آسان بھی نہیں تھا مگر اس کتاب میں ایک نمونہ ایسا بھی ہے جو ان کی تساہل پسندی کا بدترین مظاہرہ کہا جاسکتا ہے۔ آیت ۴۸ کی عبارت ہے "واتقو ايو مالا تجزى نفس عن نفسٍ شيئا ولا يقبل منها شفاعة ولا يو خذ منها عدل ولاهم ينصرون" (اور اس دن سے ڈرتے رہو جب نہ کوئی کسی کے حق میں بدلہ بن سکے گا اور نہ کسی کے حق میں سفارش قبول ہوگی، اور نہ کسی سے معاوضہ قبول کیا جائے گا اور

نہ انہیں مدد ہی پہنچ سکے گی) اور آیت ۱۲۳ کی عبارت ہے" واتقوا یوما لا تجزی نفس عن نفسٍ شیئا ولا یقبل منها عدل ولا تنفعها شفاعة ولا هم ینصرون" (اور اس روز سے ڈرو جب نہ کوئی کسی کے بھی کام آئے گا اور نہ اس کی طرف سے معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ اسے سفارش نفع پہنچا سکے گی اور نہ انہیں مدد ہی پہنچ سکے گی)

یہ دونوں عبارتیں نہایت ملتی جلتی ہوئی ہیں لیکن پوری طرح ایک جیسی نہیں ہیں۔ دونوں میں نہایت واضح فرق ہے جسے قرآن سے تعلق رکھنے والا ہر آدمی آسانی سے دیکھ اور سمجھ سکتا ہے مگر یہ فرق مترجم کے یہاں کوئی اہمیت نہیں رکھتی، اسی لئے وہ ان دونوں ٹکڑوں کا ترجمہ بالکل ایک جیسا کر دیتے ہیں اور ثانی الذکر آیت کا ترجمہ نئے سرے سے نظم کرنے اور اس پر وقت ضائع کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

ترجمہ ملاحظہ ہو۔

ایسے دن کا تم کرو سامان اب — نفسی نفسی ہوگی ہر اک جان جب
کیا شفاعت، کیا سفارش، عرضیاں — کوششیں اس روز ہونگی رائگاں
تم سے دنیا میں ہوئی سرزد جو بھول — بدلے میں تاواں نہیں ہوگا قبول
عاجز و مجبور ہوں گے نیک و بد — کچھ نہیں دی جائے گی ان کو مدد

ایک ایسے مترجم سے جس کی نظر میں عبادت اور پوجا برابر ہے کہ وہ آیت ۲۱ میں "یا أیها الناس اعبدوا" کا ترجمہ بندو! اپنے رب کی تم پوجا کرو کرتے ہیں یا انہیں پوجا کرنا اور پوجنا کا فرق نہیں معلوم ہے جبھی تو وہ یہ حاشیہ چڑھا کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ "پوجا: پرستش، عبادت؛ یہ مصرع وزن کے لحاظ سے مذکورہ

الفاظ کا متحمل نہیں ہوسکتا اس لئے مجبوراً پوجا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔'' وہ اگر چاہتے تو اس مصرع کو یوں بھی نظم کر سکتے تھے ''بندو! اپنے رب کو تم پوجا کرو'' وہ اگر 'کی' کی جگہ 'کو' کا استعمال کرتے تو بات کافی حد تک بن سکتی تھی۔ عبادت و بندگی کے لئے پوجنا استعمال ہوتا ہے اور ہر مذہب کے لوگ اپنے اپنے انداز سے اپنے معبود کو پوجتے ہیں لیکن پوجا کرنا ہمارے سماج میں ایک مشہور و متعارف فعل ہے۔ ہندو حضرات ہی پوجا کرتے ہیں۔ مسلمان اپنے رب کو پوجتے ضرور ہیں مگر اس کی پوجا نہیں کرتے۔ اور جس کو تولید ولد اور اتخاذ ولد، لڑکا پیدا کرنے اور لڑکا بنا لینے کا فرق نہیں معلوم ہے، ہم اس سے اچھے اور مناسب ترجمے کی امید کیسے کر سکتے ہیں۔ آیت ۱۱۶ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے عیسائیوں کے اتخاذ ولد کے عقیدے کا ذکر فرمایا ہے۔ کہیں عقیدۂ تولید ولد کا بھی ذکر آیا ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا ماننے والے لوگ دو طرح کے ہیں۔ کچھ کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے نطفے سے پیدا ہوئے ہیں اور کچھ کا یہ ہے کہ وہ اللہ کے نطفے سے تو نہیں پیدا ہوئے مگر اللہ نے ان کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ اللہ علیم وحکیم نے موقع ومحل کی مناسبت سے دونوں طرح کے افراد کے عقائد کا ذکر کیا ہے اور ان کے خیال کی تردید کی ہے۔ پتہ نہیں لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ محض عربی زبان سے تھوڑی بہت آشنائی سے کوئی مترجم قرآن اور مفسر قرآن نہیں ہوسکتا، وہ بھی ایسا جو اپنے بزرگ ولائق اسلاف کی تحقیقات کو ذرا اہمیت نہ دیتا ہو اور اپنے معمولی علم ہی کو سب کچھ سمجھتا ہو۔ ایسے لوگ اللہ رب کائنات کے کلام کو تختۂ مشق کیوں بناتے ہیں؟

اب مجھے مقالہ ختم کرنا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ بات اب بھی ختم نہیں ہوتی ہے۔ اتنی ساری رنگ برنگی غلطیوں کی وضاحت کے بعد بھی میں برملا یہ اعتراف کرتا

ہوں کہ میں اس مضمون کا حق ادا نہیں کر پایا ہوں۔خود میں نے جتنی جگہوں پر نشان لگایا ہے ان سب کو بھی میں وقت اور مقالہ میں گنجائش کی تنگی کی وجہ سے پوری طرح آپ کے سامنے نہیں لا سکا ہوں، اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی اعتراف کرنا ہے کہ ۲۸۶ آیتوں والی اس سورۂ بقرہ میں تین سو سے زائد جگہوں پر نشان لگانے کے باوجود اس میں اور بھی ڈھیر ساری غلطیوں کی گنجائش موجود ہے۔ایسی صورت میں اس منظوم ترجمۂ قرآن کو کہاں تک باقی رکھنے کا حق حاصل ہے، اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔میں انتہائی ادب واحترام کے ساتھ قرآن مجید کا یہ مقدمہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔آپ نائبین رسول اور جانشین خداوند قدوس ہیں اور ہر حال میں علمائے حق کو حق کا ساتھ دینا اور اس کو پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کرنا ہے نیز برائیوں کو پنپنے سے روکنے کے لئے ہر ممکن سعی کرنا ہے۔

میں اس مقالہ کا اختتام ایک خصوصی گزارش کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ رب العالمین کی آخری کتاب اور مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کے نام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے اس لئے اس کے ساتھ کھلواڑ کرنے کی نہ صرف کسی کو اجازت نہیں دی جانی چاہئے بلکہ ایسی کسی بھی کوشش کو پہلے ہی مرحلے میں آگے بڑھنے سے روک دینا چاہئے۔اب تک ہماری نظر میں ایسی کوئی تنظیم نہیں ہے جو خاص طور پر اس پر نظر رکھتی ہو اور قرآن مجید سے متعلق شائع ہونے والے ہر قسم کے مواد کا گہرائی سے مطالعہ کرتی ہو۔اس عاجز وناچیز کی یہ رائے تھی کہ مخدومی واستاذی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی مخلصانہ اور مومنانہ کوششوں سے منصۂ شہود میں آنے والا عظیم ادارہ ''رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ'' یہ فریضہ انجام دینے کی کوشش کرتا۔اس کے تحت ایک ایسی ذیلی تنظیم ہوتی جس کی شاخیں ملک بھر

میں بلکہ دنیا بھر میں قائم ہوتیں اور ان میں ایسے افراد متعین کئے جاتے جو عربی زبان کے ساتھ علاقائی زبانوں سے بھی واقفیت رکھتے نیز علوم قرآنیہ سے بھی نسبت اور شغف رکھتے۔ یہ تنظیم ہر اس مواد پر نظر رکھتی جو قرآن مجید کے تعلق سے شائع ہوتا اور اس کا گہرائی سے مطالعہ کرتی۔ جہاں کہیں قابل تحسین بات ہوتی اس کی حوصلہ افزائی کرتی اور جہاں کہیں مشتبہ چیز نظر آتی اس کا گیرائی سے جائزہ لے کر اسے صدر دفتر کے ذمہ داروں کے پاس روانہ کر دیتی، اس کے بعد علوم قرآنیہ کے ماہرین اس کا جائزہ لے کر اس کے تعلق سے اپنی رائے ظاہر کرتے اور اس کے خلاف مناسب اور بروقت کاروائی کی جاتی۔ میری ناقص رائے میں یہ ایک ضروری اور عمدہ کام ہے جس کی طرف ''رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ'' کے ذی قدر اور اصحاب علم ذمہ داران کو متوجہ ہونا چاہئے۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

علامہ سید سلیمان ندویؒ بحیثیت صحافی

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ برصغیر ہند و پاک کی ان عظیم علمی شخصیتوں میں تھے جنہوں نے آزادیٔ ہند سے قبل حصول آزادی کے لئے کی جانے والی کوششوں میں سنجیدہ علمی وادبی دائرہ میں رہتے ہوئے مؤثر انداز میں شرکت کی، وہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کے ساتھیوں میں تھے، اور موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو سے بھی ان کا ربط وضبط تھا، وہ ملک کی اہم علمی وادبی اکیڈمی دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ذمہ دار رکن اور منتظم تھے، اس اکیڈمی کو جو اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے پُر مغز اور مؤثر لٹریچر تیار کرنے کے لئے قائم ہوئی تھی اس وقت کے نامور مفکر و مؤرخ علامہ شبلی نعمانی نے قائم کیا تھا، علامہ شبلی سے مولانا ابوالکلام آزاد بھی ربط رکھتے تھے، اور سید سلیمان ندوی تو ان کے خاص شاگرد ہی تھے، علامہ شبلی نعمانی اردو ادب کے اساطین میں تھے، اور ان کا تاریخ وادب پر جو لٹریچر ہے اس نے ہندوستان کے اردو داں طبقہ کو ہمت وحوصلہ دیا، یہ ہمت وحوصلہ اسلامی دائرہ میں بھی تھا اور وطنی دائرہ میں بھی تھا۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ نے اس سلسلہ میں اپنے استاد کی بہت اچھی نیابت کی، اور تاریخ وادب کے موضوع

پر اچھا لٹریچر فراہم کیا، ان کا اسی کے ساتھ ساتھ صحافتی دائرہ میں بھی خاصہ حصہ رہا، وہ کچھ عرصہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ ان کے مشہور صحافتی کام ''الہلال'' اور'' البلاغ'' میں شریک ادارت بھی رہے، اور ان کے بعض اہم اور اثر انگیز مضامین ان کے قلم سے ایسے بھی نکلے جن کا اچھا شہرہ ہوا، ان میں مشہد اکبر کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ وہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے آرگن ''معارف'' کے چیف اڈیٹر رہے، اور ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''الندوہ'' کے ادارۂ تحریر کے سرپرست بھی رہے۔ ان دونوں پرچوں کے اداریوں کے ذریعہ سے انہوں نے اپنے وقت اور ملک کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے تعمیری مقاصد کی اچھی ترجمانی کی، ان کا اسلوب ایک دلکش اور متوازن اسلوب نگارش تھا جس میں علم و ادب کی باہم آمیزش ہوتی تھی، وہ ایک طرف علمی سطح پر ٹھوس اور سنجیدہ علمی مواد کا سہارا لیتے، دوسری طرف اس کو سہل اور دلپسند انداز میں ادا کرتے، ان کے اس اسلوب نے اس وقت کے اہل علم کے دلوں میں ایک جگہ بنائی، اور متعدد شائقین نے اس اسلوب کو اختیار کرنے کی کوشش کی اور اس کی نقل کی، اور ان کے شاگرد اس سلسلہ میں ان کے خوشہ چیں بنے۔

ندوۃ العلماء کا آرگن " الندوۃ "زیادہ مدت تک جاری نہیں رہ سکا، لیکن دارالمصنفین اعظم گڑھ کا آرگن ''معارف'' برابر جاری رہا، مولانا سید سلیمان ندوی کا چونکہ دارالمصنفین اعظم گڑھ میں ہی قیام رہتا تھا، اس کے وہ ناظم تھے اس لئے معارف سے ان کا ادارتی تعلق ان کے دوران قیام میں مسلسل جاری رہا، ان کا طرز تحریر ایسا تھا کہ اس کا اسلوب ایک طریقہ سے اسکول بن گیا، جس کو علم و ادب کی آمیزش کے ساتھ مؤثر انداز میں حالات وضروریات کی ترجمانی کا ایک انداز کہا

جاسکتا ہے، اس کی پیروی بعد میں برابر کی جاتی رہی۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تحریر و تصنیف کا اصل موضوع تاریخ و ادب اور اسلامیات کے موضوعات تھے، اور تاریخ ایک ایسا موضوع ہے جس کی ادائیگی کے لئے ایسے اسلوب کو اختیار کرنا پڑتا ہے جو سہل الفہم بھی ہو اور دلپسند بھی ہو، اور اس کے ساتھ اگر ادب کا ذوق بھی شامل ہو جائے تو اس کی طاقت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ ایک خاص انداز کا صحافتی اسلوب بن جاتا ہے، ہم مولانا سید سلیمان ندوی کے صحافتی انداز کو اسی کیفیت کے ساتھ وابستہ کر سکتے ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی کا دور اس ملک کا بہت اہم دور تھا، اس ملک میں اس وقت تحریک آزادی اپنے شباب کو پہونچی ہوئی تھی، اس کی قیادت ہندو اور مسلم دونوں فرقوں کے رہنما جو آزادیٔ وطن کے بھی رہنما تھے کر رہے تھے، اور اس تحریک کو قوت دینے کے لئے اگر ایک طرف خطابت کی ضرورت تھی تو دوسری طرف صحافت کی بھی ضرورت تھی، چنانچہ اس وقت کے ماہرین ادب و زبان اس ضرورت کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے اپنے فریضہ کو انجام دے رہے تھے، مولانا سید سلیمان ندوی نے مختلف صلاحیتوں کے اظہار کے ساتھ بحیثیت صحافی کے بھی ایک اچھا رکارڈ قائم کیا، اور ان کی اس صلاحیت سے بھی اس ملک کے باشندوں کو رہنمائی ملی، اور ان کے جذبۂ حریت کو مہمیز بھی ہوئی، اور ایسی صحافت جو صرف جوش ہی پیدا نہ کرے، اور صرف حوصلہ ہی نہ بڑھائے بلکہ ذہنوں کی صحیح آبیاری بھی کرے، اس قوم کے لئے جو غلامی کی صعوبتیں اور نقصانات سے گذر کر آزادی کی نعمت کی دہلیز تک پہنچ چکی ہو، اس کو ایسی صحافت کی بڑی ضرورت تھی، اس میں مسلمانوں کے حلقہ سے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی

خاں خاص طور پر اور مولانا سید سلیمان ندوی اور ان کے فیض یافتہ رفقاء بخوبی پیش کئے جاسکتے ہیں، انہوں نے ایسی صحافت اختیار کی جو تعمیری تھی، اور یہ عہد تعمیری صحافت اور تعمیری قیادت کا سب سے زیادہ ضرورتمند تھا، غالباً اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ان لوگوں نے اس طرز صحافت کو اختیار کیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کو بحیثیت صحافی کے خاص طور پر اس لئے بھی پیش کیا جانا چاہئے کہ انہوں نے ایک طرح سے ایک صحافتی اسکول کی بنیاد ڈالی، جس کی پیروی ان کے شاگردوں نے اور ان کے علمی خوشہ چینوں نے مدت تک کی، اور ابھی اس سلسلہ کو موقوف نہیں کہا جاسکتا، مولانا سید سلیمان ندوی اس لحاظ سے بحیثیت صحافی کے ایک نمایاں مقام پر فائز قرار دیئے جاسکتے ہیں، اور انہوں نے جو اسکول قائم کیا اس کے خوشہ چینوں کی تحریروں اور صحافتی اداریوں میں اس کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں، اس اسلوب صحافت کے نمونے خود مولانا سید سلیمان ندوی کی تحریروں سے لئے جائیں تو بات طویل ہوگی۔

مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھنے لکھانے کا شوق اوائل عمری ہی سے تھا، ندوہ آنے سے قبل ہی وہ مضمون نگاری کا آغاز کر چکے تھے، اپریل ۱۹۰۶ء میں رسالہ "الندوۃ" کے نائب مدیر ہونے، اور مضمون نویسی کے ساتھ ساتھ رسالہ کی کتابت و طباعت کی نگرانی بھی کرنے لگے، ہر ماہ علمی خبریں دینا سید صاحب کا ایک کالم بن گیا، الندوہ کی ادارت جو درحقیقت علامہ شبلی کی زیر سرپرستی نائب مدیر کی سی تھی، علامہ شبلی کے رنگ و آہنگ اختیار کرنے کا اچھا نمونہ رکھتی ہے، علامہ شبلی کا ان کو اعتماد حاصل رہا، اور ندوہ نے اس وقت کے مسلم علمی صحافت کا ایک نیا راستہ بنایا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ الہلال میں جب مولانا سید سلیمان ندوی نے شرکت کی تو

بعض ایسے مضامین بھی لکھے کہ جو کسی کا نام نہ دیئے جانے کی وجہ سے مولانا آزاد کے قلم کی تحریر معلوم ہوتے تھے، اس میں مشہد اکبر کو خاص طور پر بتایا جاسکتا ہے۔

مولانا شبلی کے انتقال کے بعد جب مولانا سید سلیمان ندوی صاحب دارالمصنفین سے پورے طور پر وابستہ ہوگئے تو معارف کی ادارت کی پوری ذمہ داری انہوں نے سنبھال لی، جس کا سلسلہ ان کے انتقال کے قریب تک رہا، معارف نے ماہانہ صحافت کا ایک اونچا معیار قائم کیا، اور ذہن سازی میں اس نے ایک اچھا کردار انجام دیا، سید سلیمان ندوی صاحب کے شذرات اس میں ممتاز حیثیت کے ہوتے تھے، جو اپنا مخصوص اسلوب رکھتے تھے، اپنی اس خصوصیت کی بنا پر وہ ماہانہ صحافت کا ایک الگ اسکول قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس طریقہ سے سید صاحب نے زندگی کا ایک بڑا حصہ صحافتی کام میں صرف کیا، جو اسلامی و علمی صحافت کے دائرہ میں ایک قابل تقلید اسلوب بن گیا، اس لحاظ سے سید سلیمان صاحب کی صحافتی حیثیت بھی ایک نمایاں حیثیت قرار دی جاسکتی ہے جس کا ثبوت ان اداریوں اور تبصروں اور مضامین سے پیش کیا جاسکتا ہے جو الندوہ اور معارف کے صفحات میں پائے جاتے ہیں۔

معارف کے شذرات اپنا ایک رنگ و آہنگ رکھتے ہیں جس کے انداز اور معیار کو ان کے جانشینوں نے بعد میں قائم رکھا، اس کو دیکھ کر اس کی خوبی اور نفاست کا بڑا احساس ہوتا ہے، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس خصوصیت کو ان کے شذرات سے دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔

مولانا محمد شعیب کوٹی

عامر عثمانی ایک فراموش شدہ عالم

مولانا امین الرحمٰن عامر عثمانی کا اصل وطن دیوبند ضلع سہارنپور تھا، ان کی پیدائش ۱۹۲۰ء میں ہردوئی میں ہوئی، جہاں ان کے والد مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی بسلسلۂ ملازمت کافی عرصہ تک مقیم رہے، وہ دیوبند کے ایک سربرآوردہ خاندان کے ممتاز فرزند تھے، اور خود مولانا کے والد بھی سالکین راہ سلوک وطریقت کے لئے ایک مرجع کی حیثیت رکھتے تھے، ان کی تعلیم وتربیت دیوبند میں ہوئی، ۱۸ سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد مطالعہ اور مختلف اخبارات ورسائل کے لئے مضامین لکھنے کا شغل اختیار کیا۔

عامر عثمانی ذہن رسا اور فکر بلند کی دولت سے مالا مال تھے، عنفوان شباب سے ان کے جوہر کھلنے لگے تھے۔ دیوبند کے گلی کوچوں میں ان کا کلام گونجنے لگا تھا اور ان کے کہے ہوئے آزادی کے نغمے بھی دیوبند کے جلسوں کی زینت بننے لگے تھے، آغاز میں وہ شاعر کی حیثیت سے متعارف ہوئے، لیکن ایک پختہ کار اہل قلم کی حیثیت سے ان کا شہرہ ماہنامہ تجلی کی دین ہے جسے خود عامر صاحب نے نومبر ۱۹۴۹ء میں دیوبند سے جاری کیا اور ۲/اپریل ۱۹۷۵ء میں اپنی وفات تک اس کے تمام مضامین خود اپنے قلم

سے لکھتے رہے، پھر عامر عثمانی نے جو کچھ لکھا وہ سب تجلی کے توسط سے منظر عام پر آیا، ان کی مستقل تصنیف کوئی بھی نہیں ہے، اسلامی اور خاص طور پر عہد نبوت اور خلافت راشدہ کے منظوم حالات پر مشتمل جدید شاہ نامہ اسلام کے نام سے جو نظم کتابی شکل میں پائی جاتی ہے اس کی تکمیل بھی ہوئی۔

طلاق ثلاثہ اور اس سے متعلق مباحث پر اسلامک ریسرچ سینٹر احمد آباد گجرات میں نومبر ۱۹۷۳ء میں ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی، اس میں ہندوستان کے سات مقتدر علماء نے اپنے مقالات پیش کئے اور مذاکرہ کے بعد ان کے دستخطوں کے ساتھ ایک بیان شائع ہوا، اس میں ایک مجلس میں تین طلاق کے مغلظہ بائنہ قرار دیئے جانے کو اجماع کے خلاف اور اسے اختلافی مسئلہ قرار دیا گیا تھا، مذکورہ ساتوں علماء میں سے پانچ حضرات کے مقالات ماہنامہ ''زندگی'' رامپور کے طلاق نمبر میں یکجا شائع ہوئے تو مولانا عامر عثمانی نے ان مقالوں کا انتہائی باریک بینی اور دقت نظر سے مطالعہ کیا اور تجلی کے ایک خاص نمبر میں ان پر عالمانہ نقد کی نئی طرح ڈالی، موضوع کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی، طلاق سے متعلق احادیث وآثار کی مدد سے، نیز متقدمین ومتاخرین علماء کے حوالوں سے اور عہد نبوت ودور صحابہ کے واقعات سے استشہاد کر کے علم وتحقیق کا حق ادا کر دیا، اس پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ تھا کہ ''عامر عثمانی صاحب نے تمام علماء دیوبند اور احناف کی خاموشی کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ یہ مقالہ تین سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل کتابی شکل میں کتب خانہ نعیمیہ دیوبند سے شائع ہو چکا ہے۔ عامر صاحب کی تعلیم وتربیت شہرہ آفاق درس گاہ دارالعلوم دیوبند میں ہوئی، فاضل دارالعلوم کی حیثیت سے ان کا شمار دارالعلوم کے ممتاز علماء میں ہوتا تھا، ان کی شناخت عالم کی تھی

ور یہی شناخت عامر صاحب کی شاعری کا امتیاز بنی۔

عامر صاحب نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی لکھیں، نہ ونعت میں بھی خاصا سرمایہ چھوڑا، ان کے پورے کلام پر سرسری نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عامر بحیثیت شاعر بھی ایک صحیح الفکر عالم کی حدود سے کہیں بھی متجاوز ہوتے نظر نہیں آتے ہیں، ان کی غزلوں میں واردات اسی طرح منظوم ہوتے ہیں کہ صنف کو نظر انداز کردیں تو ان پر بھی حمد ونعت کا گمان گزرتا ہے۔ ان کی نظمیں بھی اسی تنوع کی حامل ہیں، ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

اے کہ تو وادیٔ ظلمت میں ہے مینارۂ نور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور
تجھ کو معلوم تو ہوگا کہ میرا آئینہ
ہو چکا میرے ہی اوہام کی بوچھار سے چور
تجھ کو معلوم تو ہوگا کہ مری دنیا میں
روشنی کی نہیں کوئی بھی کرن پاس نہ دور
تحفۂ نعت ہی لاؤں تو کہاں سے لاؤں
زہر سے پاک نہ سینہ، نہ تخیل نہ شعور
اے کہ توڑا ہے ترے فقر نے شاہی کا غرور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور
چند الفاظ کے موتی ہیں مرے دامن میں
ہے مگر تیری محبت کا تقاضا کچھ اور
دل عقیدت کی تب وتاب سے خالی تو نہیں

ہے مگر عشق کی غیرت کا تقاضا کچھ اور
نہ غلامی کا سلیقہ ہے نہ جینے کا شعور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

میں نے تجھ سے کبھی پیمان وفا باندھا تھا
وہ مگر قصۂ ماضی کے سوا کچھ بھی نہیں
جنس اخلاص کو طوفان ہوس لے ڈوبا
اب کوئی قول وقسم عہد وفا کچھ بھی نہیں
میری نظروں سے ہوئی اپنی حقیقت مستور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

اب مرے ہاتھ میں نیزا ہے، نہ تلوار نہ ڈھال
کیوں نہ پھر اہل ستم کا ستم وجور بڑھے
میں تو اک جام سفالیں کا بھی حقدار نہیں
کس لئے میری طرف ساغر بلور بڑھے
خون انصاف مشیت کا نہیں ہے دستور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

میں کسی اور کو الزام نہیں دے سکتا
اپنی تاریخ کو خود قتل کیا ہے میں نے
تو نے جس زہر سے بچنے کی ہدایت کی تھی
اپنے ہاتھوں سے وہی زہر پیا ہے میں نے
دل کی دنیا ہے تصاویر بتاں سے آباد

صرف ہونٹوں سے ترا نام لیا ہے میں نے
کھا چکی زنگ مرے ذوق عمل کی شمشیر
راستہ خود ہی تباہی کو دیا ہے میں نے
نہ مقدر کی خطا ہے نہ زمانہ کا قصور
اے کہ تو وادیٔ ظلمت میں ہے مینارۂ نور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے بقول جب بھی شاعر محدود سے لامحدود کی طرف سفر کرتا ہے تو وہ حمد و نعت کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اکثر تو شاعر کو خود بھی اپنے اس سفر کی خبر نہیں ہوتی۔ ایک بار حضرت احسان دانش نے اپنا یہ شعر سنایا:

ہوائیں ماری ماری پھر رہی ہیں
ترا نقشِ کف پا ڈھونڈنے کو

شعر سن کر میں نے بے ساختہ کہا کہ ''نعت کا کیسا اچھا شعر ہے'' مرحوم نے فرمایا کہ ''میں نے تو یہ شعر نعت میں نہیں کہا ہے'' میں نے عرض کیا کہ تخلیق ایک بے حد پیچیدہ اور طلسماتی عمل ہے۔ ضروری نہیں کہ فن کار کو تخلیق کے ہنگام اپنے عمل کے تمام محرکات و عوامل کا علم و شعور ہو۔ تخلیق میں تو ہمارا پورا وجود شامل ہوتا ہے۔'' پھر بات کا رخ کسی اور طرف مڑ گیا۔ خاصی دیر کے بعد احسان دانش مرحوم چونکے، میرے طرف مڑے اور کہنے لگے ''تم نے ٹھیک ہی کہا تھا''

عامر عثمانی بھی اس کلیہ سے مبرا نہیں ہیں، ان کی غزلوں کے موضوعات میں گل و بلبل کی جگہ دار و رسن کو نمایاں مقام حاصل ہے، وہ اکثر پامال خیالات کو مختلف انداز سے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ آج کے دور کا ہر شخص اپنے آپ کو اس

سے اتفاق کرنے پر مجبور پاتا ہے اور ہر ایک کو اپنی بات کہنے کے لئے ایک نیا اسلوب مل جاتا ہے۔

یہاں عامر عثمانی کے غزلوں کی چنیدہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

مری زندگی کا حاصل ترے غم کی پاسداری
تری غم کی آبرو ہے، مجھے ہر خوشی سے پیاری
یہ قدم قدم بلائیں یہ سواد کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری
ترے جاں نواز وعدے مجھے کیا فریب دیتے
ترے کام آگئی ہے مری زودا عتباری
مری رات منتظر ہے کسی اور صبح نو کی
یہ سحر تجھے مبارک جو ہے ظلمتوں کی ماری
جو غنی ہو ماسوا سے وہ گدا گدا نہیں ہے
جو اسیر ماسوا ہو وہ امیر بھی بھکاری

نہ تاب نظارہ میرے بس میں نہ ضبط غم میری دسترس میں
تری حکومت نظر نظر پر ترا تصرف نفس نفس میں
کسی کا دامن تو آچکا تھا ہمارے دست جنوں کے بس میں
برا ہو اس ہوش و آگہی کا، اُلجھ گئی عقل پیش و پس میں
نصیب ہو لذت حضوری تو زندگی مستقل عبادت
اگر میسر نہیں حضوری عبادتیں بھی فضول رسمیں

کوئی مری سادگی تو دیکھے میں اب بھی وعدوں پہ جی رہا ہوں
فضا میں تحلیل ہو چکے ہیں ہزار وعدے ہزار قسمیں
درست صیاد کا ستم بھی مگر حقیقت تو یہ ہے عامر
جو ننگ آداب گلستاں ہیں وہ لا کے رکھے گئے قفس میں

اس درجہ پائمال نہ ہوتے جفا سے ہم
لوٹے گئے سیاست مہر ووفا سے ہم
یہ کیا کہا جنوں ہے محبت کی انتہا
اے بے خبر چلے ہیں اسی انتہا سے ہم
مانا کہ دل کو تیرے نہ ملنے کا غم رہا
صد شکر بچ گئے طلبِ ماسوا سے ہم

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دل رنجور ہوتا ہے
مگر انسان ہنسنے کے لئے مجبور ہوتا ہے

یہ عبادتیں مرصع یہ سجود مجرمانہ
مجھے ڈر ہے بن نہ جائیں مرے کفر کا بہانا
یہ سمجھ کے اس نے بخشی کبھی دولتِ سکوں بھی
کہیں راس آ نہ جائے مجھے گردشِ زمانہ
وہ کبھی جہاں پہ عامر مجھے چھوڑ کر گئے تھے
ہے رُکی ہوئی ابھی تک وہیں گردشِ زمانہ

بجا کہ ناحق شناسیوں میں، گزاردی، ہم نے عمر ساری
مگر ہماری سیاہ کاری، ترے کرم سے سوا نہیں ہے
ہزار عنواں بدل بدل کر فسانۂ عشق کہہ چکا ہوں
مگر یہ محسوس ہو رہا ہے، کہ جیسے کچھ بھی کہا نہیں ہے
غم مسلسل کی تلخیوں نے بدل دیا ہے مزاج دل کا
امنگ ہے آرزو نہیں ہے، تلاش ہے مدعا نہیں ہے

خوشا نادانی ارباب دانا
قفس کو کہہ رہے ہیں آشیانہ
چمن میں جی رہا ہوں مثل شبنم
مری تقدیر ہے آنسو بہانا
کوئی اے کاش غنچوں کو بتاتا
بہت مہنگا پڑے گا مسکرانا

جو ذرا بھی نیند آئی کبھی اہل کارواں کو
وہی بن گئے لیٹرے جو بنے ہوئے تھے ہادی
وہ کبھی نہ بن سکی ہے، وہ کبھی نہ بن سکے گی
کسی دل کی جو عمارت تری بے رخی نے ڈھادی

جس کے جلو میں جہد و عمل کی تڑپ نہ ہو
وہ صرف اک فریب دعا ہے دعا نہیں

منبر سے لے کے مدرسہ وخانقاہ تک
عامر کہاں ہجوم نمود وریا نہیں

ہزاروں طاق سجے سیکڑوں چراغ جلے
ہماری رات کے سائے مگر ذرا نہ ڈھلے
بتوں کے در سے ہو جو عزت وحشمت
ہم ایسی عزت وحشمت سے دور دور بھلے

یہ جو کئی سودائی عامر آج درِ جاناں پہ پڑے ہیں
مدت گزری واعظ بن کر آئے تھے مجھ کو سمجھانے

مری نظر میں وہی سر ہے سر جسے کہے عامر
زمانہ کاٹ تو ڈالے مگر جھکا نہ سکے

عامر عثمانی کی نثر میں ادب کی چاشنی بھی ہے اور بیان کی سلاست ورعنائی بھی۔ خواہ تجلی کی ڈاک میں فقہی موضوعات پر قلم کی جولانی دکھانی ہو یا شرک وبدعت اور مروجہ رسوم وخرافات پر صفحات کے صفحات سیاہ کرنے ہوں یا کھرے کھوٹے نامی کالم کے تحت علمی، ادبی، دینی کتب پر تبصرہ، بقول ماہر القادری انہوں نے ہزاروں صفحے شرک وبدعت کی تنقیص وتردید میں لکھے اور مشرکانہ عقائد ورسوم کے ایک ایک جزئیہ کا احتساب کیا ہے۔

''فاران'' کراچی میں کتابوں پر جس انداز میں نقد وتبصرہ کیا جاتا ہے، یہ

انداز کئی رسالوں نے اختیار کیا مگر وہ اسے نباہ نہ سکے، مولانا عامر عثمانی نے تجلی میں اس انداز کو پوری طرح برقرار رکھا۔ علمی مباحث اور کتابوں پر تجلی کی تنقیدوں کا جواب نہیں یہ مولانا عثمانی کا حصہ تھا۔

تفسیر وحدیث فقہ وتاریخ، لغت وادب، غرض تمام علوم میں مولانا کو قابل رشک بصیرت حاصل تھی۔ جس مسئلہ پر قلم اٹھاتے ان کا حق ادا کر دیتے، ایک ایک جزئیہ کی تردید یا تائید میں امہات الکتب کے حوالے پیش کرتے۔ علمی اور دینی مسائل میں ان کی گرفت اتنی سخت ہوتی کہ بڑے بڑے چغادری اور اہل قلم پسینہ پسینہ ہو جاتے! انہیں اپنی رائے اور فکر پر، مطالعہ اور استدلال پر پورا اعتماد تھا اس لئے ہر عالم اور مفکر سے بلند وبالا ہو کر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے! راقم الحروف ان کی تحریر کا ایک ایک لفظ پڑھتا اور پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا کہ میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ مولانا عامر اپنی ذات سے دبستان علم وفضل تھے۔

''مولانا عامر عثمانیؒ کے فقہی جوابات میں ناول جیسی ادبی دلچسپی اور زبان کی چاشنی ہوتی، کیسے کیسے نازک مسائل کی مرحوم نے کس حذاقت ومہارت کے ساتھ گرہ کشائی کی ہے! ''مسجد سے میخانے تک'' ماہنامہ ''تجلی'' کا مستقل عنوان تھا۔ اس میں مزاح وظرافت کا وہ چٹخارہ کہ:

فتاد ذائقہ در موج کوثر وتسنیم

مزاح وظرافت کا مقصد لوگوں کی تفریح طبع اور ہنسنا ہنسانا نہیں بلکہ عبرت و موعظت کا درس دینا تھا! ان چٹکیوں اور گدگدیوں میں وہ بڑے کام کی باتیں کر جاتے۔

ماہر القادری نے عامر صاحب پر ''فاران'' میں جو تعزیتی تحریر شائع کی تھی

یہ اقتباس اسی سے لیا گیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس تحریر سے عامر عثمانی کی متنوع صلاحیتوں کی ایک ہلکی سے جھلک سامنے آجاتی ہے۔ یہ تو وہ تحریر تھی جو ماہر القادری نے عامر صاحب کی وفات پر لکھی، مولانا عامر عثمانی نے بھی بہت سے مشاہیر پر لکھا اور خوب لکھا، مولانا ابوالکلام آزاد پر عامر صاحب کا وفیہ اس قدر زوردار ہے کہ خدا بخش لائبریری پٹنہ کے عابد رضا بیدار نے اس کو اردو کے بہترین ادبی شہ پاروں میں شمار کیا ہے، چنانچہ بیدار صاحب نے اچھے نثر نگاروں اور ان کے نثر پاروں کے اپنے انتخاب کردہ مجموعہ میں بھی اس کو شامل کیا ہے، مولانا آزاد پر اس قدر خوبصورت تحریر کی نظیریں شاذ و نادر ہی ملیں گی۔

عامر صاحب تجلی میں کھرے کھوٹے کے عنوان سے کتابوں پر تبصرہ لکھا کرتے تھے اور جب کبھی کوئی کتاب طویل تبصرہ کی مقتضی ہوئی تو اس پر علاحدہ سے قلم اٹھاتے تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی تفسیر ماجدی جلد دوم تبصرہ کے لئے ملی تو اس کی اہمیت کے پیش نظر عامر صاحب نے اس پر جو تبصرہ لکھا ہے وہ تجلی کے گیارہ شماروں میں ستر (۷۰) سے زیادہ صفحات پر محیط ہے، پہلی قسط تجلی جون ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔ اور آخری قسط دسمبر ۱۹۷۴ء کے شماروں میں طبع ہوئی۔

جہاں یہ تبصرہ اہل علم کے لئے گراں قدر تحفہ ہے۔ وہیں تبصرہ نگاروں کے لئے تبصرہ کی اعلیٰ روایات کی مثال بھی، عامر صاحب نے شروع میں لکھا ہے کہ تبصرہ کچھ زیادہ مشکل نہیں اگر وہی روش اختیار کی جائے جو ہمارے زمانہ میں عام ہے ۔ چند ورق اِدھر سے اُلٹے چند ورق اُدھر سے الٹے۔ تھوڑی سی تعریف کی، ہوگیا تبصرہ مکمل۔ ایک صاحب نے تو اس سے بھی آسان ترکیب نکالی ہے، کتاب کی کچھ

سطروں پر نشان لگا کر کاتب کو دے دیتے کہ نقل کر دو یہاں سے، اور شروع میں لکھ دیتے کہ ناشر یا مصنف ایسا فرماتے ہیں بس ہو گیا تبصرہ) مزید لکھتے ہیں:

"تبصرے کا یہ دروبست مناسب معلوم ہوا کہ جہاں تک متن قرآن اور ترجمے کا تعلق ہے اس پر تو ایک ہی صحبت میں اظہار خیال کر دیا جائے البتہ تفسیری نوٹوں پر گفتگو ہر سورت کو مستقل مان کر ہو اس طرح مجلسیں تو متعدد ہو جائیں گی لیکن حق تبصرہ بھی کھل کر ادا ہو گا۔ یہ خوش فہمی ہمیں ہرگز نہیں کہ اس کارِ اہم کی اہلیت بھی ہم میں پائی جاتی ہے۔ ایک تو تفسیر قرآن۔ پھر مفسر مولانا دریابادی جیسے فاضل بزرگ۔ بھلا ہماری بساط ہی کیا جو کہیں انگلی رکھ سکیں مگر لاتکلف نفس الاوسعھا سے ہمت بندھتی ہے۔

تفسیر پر تبصرہ میں پہلے تو عامر صاحب نے قرآن کے متن میں در آنے والی اغلاط کی نشان دہی کی، جیسے اعراب کی غلطیاں۔ مثلاً دو حرفوں کو ملانے والی تشدید بے شمار جگہ پر مفقود ہے، نہ جانے کتنی جگہ زیر زبر پیش رہ گئے ہیں، رسم الخط میں ہونے والے تسامحات، اس سلسلہ میں عامر صاحب نے بعض قیمتی معلومات بھی فراہم کر دی ہیں جو خواص کے لئے بھی فائدہ سے خالی نہیں ہیں۔ اعراب والفاظ کی اغلاط کا ایک نقشہ پیش کیا ہے۔

تفسیر میں بعض مقامات پر زبان و بیان کے اسقام کی نشان دہی بھی کی ہے، یہ پورا تبصرہ علم و تحقیق اور زبان و ادب کا شہ کار ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، دامان نگہ تنگ و گلہائے بسیار کا معاملہ ہے ورنہ اس تبصرہ کے اقتباسات بھی

پیش کئے جاتے۔

تجلی کے ایک اور کالم ''کھرے کھوٹے'' میں عامر صاحب نے بلا مبالغہ سیکڑوں کیا ہزاروں علمی وادبی ودینی کتابوں پر تبصرہ کیا ہوگا، ان تبصروں میں نقد وجرح بھی ہے اور طنز ملیح بھی، اشاروں کنایوں میں گہری چوٹ بھی کر جاتے ہیں، ادبی وشعری مجموعوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ جہاں شاعر کے خیالات کو میزان عقل وخرد پر چڑھا دیتے ہیں وہیں حمد ومنقبت اور نعت کے اشعار میں خاص طور پر ان کا قلم کسی قسم کی رواداری کو گوارہ نہیں کرتا ہے۔

حفیظ بنارسی کے نعتیہ مجموعہ ''بادۂ عرفاں'' پر نومبر ۱۹۷۴ء کے تجلی میں پانچ صفحوں میں تبصرہ کیا ہے حمد کے ایک شعر

حمد اس کی ہمیشہ سے جس کی ذات
حمد اس کی نہیں جس کی خاطر ممات

کے دوسرے مصرعے کو مشاقی کے بجائے اناڑی پن کا مظہر بتلاتے ہیں ایک دوسری نعت کے مصرعہ

عرش کی رونق، فرش کی زینت ﷺ

پر گرفت کرتے ہیں۔ یہ کیا کہہ دیا؟ مبالغہ شاعر کا حسن سہی لیکن معاملہ جب اللہ ورسول ﷺ کا ہو تو عقائد صحیحہ کا لحاظ ضرور رکھنا چاہئے، عرش کی رونق اللہ جل جلالہ ہے نہ کہ رسول اللہ ﷺ، اچھا ہوگا کہ اس طرح کی فاسد مبالغہ آرائیاں بریلوی مکتب فکر کے لئے چھوڑ دی جائیں، منقبت کے مصرعہ:

شعلہ جوالہ میں بھی مثل گلِ خنداں

پر عامر صاحب لکھتے ہیں: حفیظ صاحب شاید اتفاق سے شعلہ جوالہ اور آتش نمرود

کے درمیان فرق بھول گئے شعلہ جوالہ اس شعلہ کو کہتے ہیں جو گرداگرد پھرے وہ ایک مختصر سی آگ سے عبارت ہے جو متحرک ہوتی اور دائرہ یا گھیرا بناتی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام جس آگ میں ڈالے گئے تھے وہ بھی بھٹی کے مانند تھی شعلہ جوالہ باعتبار محاورہ بھی غلط ہے شعلہ جوالہ ظرف کے طور پر استعمال نہیں ہوتا ہے۔جہنم، بھٹی، تنور، الاؤ وغیرہ کی طرح اس میں ظرفیت مقصود نہیں ہے، ایک دوسرے شعر کے بارے میں فرماتے ہیں: یہ خالص مشاعراتی نوعیت کی شاعری ہے جس کی سطح تو خوش نما ہوتی ہے مگر اندر بھس بھرا ہوتا ہے، بھلا کیا بات ہوئی کہ

خدا خانے نہ بنتے تو صنم خانے کہاں جاتے

صنم خانوں کو کہیں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی انہیں تو اپنے مستقل قیام کے لئے ساری دنیا خالی ملتی، اگر تھوڑی سی منطقی دل کشی پیدا ہو سکتی تھی تو یوں کہنے سے ہو سکتی تھی کہ ''اگر سارے عالم میں خدا خانے بن جاتے تو بے چارے صنم خانے کہاں جاتے'' یہ ایسا ہی ہوتا جیسا شکیل بدایونی کا مشہور مصرعہ ہے:

اگر دنیا چمن ہوتی تو ویرانے کہاں جاتے

''مسجد سے میخانہ'' تجلی کا مقبول عام کالم تھا قاری تجلی کو ہاتھ میں لیتے ہی پہلے اس کالم کی ورق گردانی کرتا تھا عامر صاحب کی مزاحیہ شاعری بھی اس کالم کے حوالے سے منظر عام پر آتی تھی۔اس کالم میں عامر صاحب ناول نگار، افسانہ نگار کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتے تھے اور انتہائی دلچسپ زبان میں بڑے بڑے اہم مسائل پر کاٹ دار جملے، برجستہ طنز، اور کام کی باتوں کے لئے معروف تھے۔زیادہ تبصرہ نہ کرتے ہوئے دو ایک اقتباسات پر اکتفا کرتا ہوں۔

وندے ماترم اور بھائی علی احمد

ہمارے حد سے بے حد سیکولر اور روادار اور فراخ دل .....دیش ہی کے ایک حصے میں جسے آج کل مہاراشٹر کہا جاتا ہے زور وشور سے یہ تحریک برادرانِ وطن نے چلائی ہے کہ وندے ماترم کا ترانہ تمام سرکاری تقریبوں اور اسکولوں میں ضرور ہی گایا جائے اور مسلمان بھی لازماً گانے میں شریک ہوں۔ غالباً بمبئی کی شہری انتظامیہ نے تو اسے بطور ضابطہ نافذ بھی کر دیا ہے۔

یہ نالائق کالم نگار تو زبان ہندی سے بالکل جاہل ہے یعنی بقول شاعر:

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

بعض مسلمانوں سے سنا اور بعض اخبارات میں دیکھا کہ اس میں کچھ مشرکانہ عقائد پائے جاتے ہیں۔ شاید اسی لئے مسلمان اس پر راضی نہیں ہو رہے ہیں۔ وہ اس زبردستی کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔

اس پردیش کے معروف بزرگ محترم جناب اچاریہ ونوبا بھاوے نے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''مسلمان ہندوستان کے اچھے شہری ہیں ان کو وندے ماترم کا احترام کرنا چاہئے۔''

کتنے شائستہ الفاظ، کتنا میٹھا لہجہ، مگر یہ عقدہ نہ کھل سکا کہ بھاوے جی نے ''احترام'' کے کیا معنی لئے ہیں۔ اگر مسلمانوں نے اس گیت یا ترانے کو گالی دی ہو یا کسی بورڈ یا بینر سے اسے کھرچا ہو یا اس کے مسودے کو سر عام جلایا ہو تب تو بھاوے جی کا دکھ بالکل برحق اور شکوہ یقیناً بجا۔ لیکن اگر بے احترامی کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان

اپنے بچوں کو اس ترانے میں عملی شرکت کی اجازت دینا نہیں چاہتے تو پھر تو محترم بھاوے جی کو سوچنا چاہئے کہ بات اسی ایک ترانے پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ مسلمان سراپا جرم ہی جرم قرار پا جاتے ہیں کیونکہ نہ وہ بتوں کے آگے جھکنے میں برادران وطن کے شریک ہو سکتے ہیں نہ وہ دوسری دھارمک سرگرمیوں میں حصہ لے سکتے ہیں۔

پھر بھاوے جی کا شکوہ تو کیا کیجئے۔ وہ بہر حال ایک ایسے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں جو اسلامی تصورِ توحید سے بے تعلق ہے۔ کمال تو محترم و مکرم بلکہ محتشم و معظم جناب فخر الدین علی احمد علیہ ما علیہ نے کیا ہے کہ فرمایا دن دہاڑے بالکل صاف صاف:

''وندے ماترم ایک قومی ترانہ ہے اور تمام فرقے کے لوگوں کو اس کا احترام کرنا چاہئے اور یہ قومی ترانہ ملک کے ہر اسکول میں گایا جانا چاہئے''

حقیر فقیر راقم التحریر کو موصوف کے دیدار خوش آثار کی سعادت نصیب ہو چکی ہے۔ دبلے پتلے، جہاندیدہ عمر رسیدہ گویا پیدائش کے دن سے قبر تک جتنا فاصلہ حیوان ناطق کے لئے کاتبِ تقدیر نے مقدر کر دیا ہے اس کا آدھے سے کہیں زیادہ طے کر چکے ہیں۔ حسن ظن یہ تھا کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے انہیں اب آخرت کی فکر دنیا کے مقابلے میں زیادہ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ عہدے اور جاہ و مال نفس کے لئے بے حد مرغوب سہی، مگر وہ قبر میں بہر حال ساتھ نہ جائیں گے۔ قبر میں ''کرسی'' رکھوا بھی دی جائے تو فرشتے بہر حال نہ سیکولر ہیں نہ کانگریسی۔ وہ بے حد فرقہ پرست اور پکے غیر سیکولر اور اک دم رجعت پسند اور غیر روشن خیال واقع ہوئے ہیں ایک اونچے قسم کے قوم پرست بھائی ابھی چند سال قبل مرے تھے۔ ان سے قبر میں منکر نکیر نے پوچھا،

''بولو میاں..... کون ہے تمہارا رب؟''

انہیں تاؤ آ گیا، یہ انداز خطاب تو دنیا میں کوئی بھی ان کے لئے اختیار نہ کر سکتا تھا۔ کفن منھ سے سرکا کر دہاڑے..... ''تمیز سے بات کرو۔ جانتے نہیں ہو ہم کون ہیں'' تجلی مئی ۱۹۷۳ء

عامر صاحب پر ان کے شعری و ادبی خیالات و رجحانات پر، علم و تحقیق کے میدان میں ان کی ژرف بینی اور نکتہ آفرینی پر اور معاصر و ہم مشرب علماء کے درمیان ان کے امتیازات پر چند صفحوں کو سیاہ کر کے کسی طرح کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا ہے ضرورت ہے کہ عامر صاحب کو مستقل اور مفصل تحقیق کا موضوع بنایا جائے۔

ڈاکٹر مفتی احتشام الحق قاسمی علیگ
حضرت عبداللہ بن مسعود اسلامی اکیڈمی حیدرآباد

محدث دکن حضرت مولانا عبداللہ شاہؒ کی تحریروں اور تقریروں میں کردار سازی کے عناصر

حیدرآباد دکن کو علم وادب کی خدمت اور کردار و بزرگی کے میداں میں جو مقام و مرتبہ حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔اس شہر سے نہ صرف یہ کہ اچھے اور بلند پایہ عالم صاحب طرز و بیاں ادیب اور اعلیٰ پایہ کے شاعر پیدا ہوتے رہے ہیں بلکہ یہ شہر بیرونی علماء ادباء اور شعراء کی شاندار مہمان نوازی کے لئے بھی مشہور ہے، نیز یہ کہ یہاں کی سرزمین بڑے عالی مرتبت بزرگوں کا گہوارہ بھی رہی ہے۔

دکن کے مایہ ناز علماء اور عظیم المرتبت بزرگوں میں حضرت مولانا عبداللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام سرفہرست آتا ہے۔وہ ایک بلند پایہ عالم دین اور عارف باللہ بزرگ تھے۔اللہ تعالیٰ نے آپ کی شخصیت کو عام اصلاح اور اخلاق وفضائل کی تربیت اور قلب کے تزکیہ کے لئے منتخب فرمایا آپ نے تعلق مع اللہ اور اخلاص واحتساب کے میدان میں ایسی نمایاں خدمات انجام دیں جو اللہ کے خاص الخاص بندوں کا حصہ ہے۔عربی اور اردو میں دس سے زائد کتابوں کے مصنف تھے،اور آپ کے علم وعرفان اور کردار و بزرگی سے لاکھوں لوگوں نے فیض حاصل کیا۔ہم

یہاں پر آپ کی شخصیت کے مختصر سے تعارف کے بعد آپ کی تحریروں اور تقریروں میں کردار سازی کے عناصر پر گفتگو کریں گے۔

نام ونسب

نام عبداللہ ہے، والد کا نام مولانا سید مظفر حسین ہے، کنیت ابوالحسنات لقب محدث دکن، نجیب الطرفین ہیں، چھپالیس واسطوں سے آپ کا نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جا کر ملتا ہے۔

پیدائش

قدیم شہر حیدرآباد کے مشہور مقام ''حسینی علم'' میں بتاریخ ۱۰/ذی الحجہ، ۱۲۹۲ھ بروز جمعہ آپ کی ولادت ہوئی۔

خاندانی پس منظر:

شیخ عبداللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے جد اعلیٰ حضرت سید علیؒ مکہ معظمہ سے سیاحت فرماتے ہوئے عادل شاہی دور میں ہندوستان کے مشہور شہر بیجاپور تشریف لے آئے، جو کہ اس وقت صوبہ کرناٹک کا مشہور شہر ہے۔ جلد ہی اہل سلطنت کو ان کی علمی قابلیت اور بزرگی کا احساس ہو گیا چنانچہ علی عادل شاہ اول نے ان کو قلعہ ''نلدرگ'' کے اندرون میں واقع شاہی مسجد کی تولیت وامامت پیش کی اور ایک وسیع خطہ آراضی بھی عنایت کیا تاکہ فکر معاش سے بے نیاز رہ سکیں۔ حضرت سید علیؒ نے اس کو قبول کیا اور ساری زندگی اسی خدمت میں گذار دی۔ ان کے فرزند سید مظفر حسینؒ یعنی حضرت عبداللہ شاہ کے والد بچپن ہی میں حصول علم کی غرض سے

''نلدرگ'' سے حیدرآباد پہنچے اور پھر حصول علم کے بعد یہیں سکونت پذیر ہوئے اور حیدرآباد کے مشاہیر میں شمار ہوئے، حیدرآباد ہی کے ایک خدا ترس بزرگ حضرت گل بادشاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اکلوتی صاحبزادی سے ان کا نکاح ہوا جو کہ محدث دکن سید عبداللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ بنیں۔

تعلیم وتربیت

سید عبداللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سید مظفر حسین سے حاصل کی پھر حیدرآباد کے مشہور معقولی وفلسفی عالم مولانا منصور علی خاں سے علم منطق وفلسفہ حاصل کیا، صرف ونحو دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ایک بزرگ سے حاصل کی۔ مولانا انوار اللہ خاں رحمۃ اللہ علیہ سے علم تفسیر وہیئت میں کسب فیض کیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ سے فقہ واصول فقہ پڑھی اور مولانا عبدالرحمٰن سہارنپوری جن کا سلسلہ حضرت شاہ اسحاق صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے جا کر ملتا ہے سے علم حدیث وآداب حاصل کئے یہ سب اساتذہ اپنے وقت کے ماہرین اور یکتائے روزگار مانے جاتے تھے۔ ان تمام اساتذہ کے ساتھ محدث دکن کا بڑا ہی عقیدتمندانہ اور سعادتمندانہ رویہ ہوتا جس کی وجہ سے وہ ہر استاذ کے منظور نظر تھے۔

درس وتدریس

حصول علم کے آخری مرحلہ پر ہی درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اور خوبی یہ تھی کہ عام طالب علموں سے ہٹ کر معمر اور کاروباری حضرات بھی مسجد علی آقا میں رات کے بارہ بجے تک آپ سے حدیث وفقہ اور دیگر علوم حاصل کرتے

رہتے اور یہ سب کچھ بلا معاوضہ ہوتا، درس وتدریس کا یہ سلسلہ تقریباً ساری زندگی تک جاری رہا۔

بیعت وخلافت

سید محمد پاشاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جو کہ بخاری شاہ کے نام سے مشہور تھے) حیدرآباد کے نامی گرامی اور صحیح العقیدہ بزرگ رہے ہیں سے محدث دکن بیعت ہوئے اور ۲۰ سال تک روزآنہ ان سے ملاقات کے لئے چار میل تک پیدل تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اوراس دوران خلافت سے بھی نوازے گئے۔

کردار و بزرگی

حضرت محدث دکن مولانا عبداللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ بڑے ہی غیرت مند عالم اور خوددار بزرگ تھے شریعت کے بڑے ہی پابند، اور بدعات سے اجتناب کرنے والے تھے، اللہ نے آپ کو عوام وخواص دونوں میں بڑی مقبولیت نصیب فرمائی تھی، حیدرآباد اور اس کے اکناف سے تقریباً پانچ لاکھ کے قریب لوگ آپ کے ارادت مند تھے اور آپ سے بڑا ہی والہانہ لگاؤ رکھتے تھے، آپ کے معتقدین کی ایک بڑی تعداد اب بھی باقی ہے۔ جاہ وحشمت اور دنیاداری سے حد درجہ پرہیز کرنے والے تھے ایک مرتبہ آپ کے ایک شاگرد جو کہ بادشاہ وقت کے مصاحب بن گئے تھے نے بادشاہ سے آپ کی بڑی تعریف کی جس پر دیگر مصاحبین نے بھی محدث دکن کی بزرگی کا تذکرہ کیا، بادشاہ اتنی تعریف سن کر ملاقات کا متمنی ہوا، جب یہ ساری باتیں محدث دکن کو معلوم ہوئیں تو اپنے شاگرد سے صاف فرمایا کہ اگر آپ مجھے خوش رکھنا چاہتے ہیں تو آئندہ وہاں میرا تذکرہ نہ کریں۔ ایک مدت تک مسجد علی

آقا واقع حسینی علم میں امامت بھی فرماتے رہے، اللہ نے آپ کو حج کی سعادت بھی نصیب فرمائی۔ محدث دکن سلسلہ نقش بندیہ وقادریہ سے وابستہ تھے، اور ظاہر شریعت کے مکمل پیروکار تھے بدعات وخرافات کو ناپسند کرتے اور کبھی نرمی اور کبھی سختی سے ٹوک دیا کرتے تھے۔ جو بھی آپ سے وابستہ ہوتا اس میں ایک خاص بات پیدا ہوجاتی کہ اس کا دل نیکیوں کی طرف راغب ہوجاتا اور اس میں برائیوں سے بچنے کا جذبہ پیدا ہوجاتا۔

وفات

تقریباً ۹۲ سال کی عمر میں ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۸۴ھ مطابق ۲۷ راگست ۱۹۶۴ھ بروز جمعرات کو آپ کی وفات ہوئی، لاکھوں لوگوں کے ہجوم میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور حیدرآباد ہی کے علاقہ مصری گنج کے قریب نقش بندی چمن میں مدفون ہوئے۔

پسماندگان:

آپ کے پسماندگان چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھے آپ کے فرزندوں کے یہ نام ہیں: ابوالبرکات سید خلیل اللہ شاہؒ، سید احمد اللہ شاہؒ، سید حبیب اللہ شاہؒ اور سید رحمت اللہ شاہ ان میں سے آخر الذکر فرزند ابھی باحیات ہیں۔

جانشین

آپ کے بعد آپ کے ہونہار اور صاحب ورع وتقویٰ فرزند ابوالبرکات حضرت سید خلیل اللہ شاہؒ آپ کے جانشین ہوئے پھر ۱۹۹۲ء میں ان کے وصال کے

بعد انہی کے معزز اور صاحب کمال فرزند ابوالخیرات سید انوار اللہ شاہ جانشین ہوئے جو ان سطور کے لکھے جانے تک اپنے پیشرو بزرگوں کے مبارک عزائم کی تکمیل اور اشاعت تعلیمات اسلام کی مساعی میں مصروف ہیں۔

تصنیفات

محدث دکن دس سے زائد چھوٹی بڑی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے ایک عربی میں اور بقیہ اردو میں ہیں، آپ کی تصانیف کے اسماء یہ ہیں۔

(۱) زجاجۃ المصابیح (عربی زبان میں مشکوۃ المصابیح کے طرز پر پانچ جلدوں میں احادیث کا مجموعہ)

(۲) نور المصابیح (زجاجۃ المصابیح کا اردو ترجمہ)

(۳) مواعظ حسنہ (مواعظ اور ارشادات کا مجموعہ)

(۴) قیامت نامہ (دنیا کی بے ثباتی اور موت وقیامت سے متعلق تذکیری کتاب ہے)

(۵) معراج نامہ

(۶) سلوک مجددیہ

(۷) یوسف نامہ

(۸) علاج السالکین

(۹) گلزار اولیاء

(۱۰) فضائل نماز

(۱۱) کتاب المحبت

(۱۲) فضائل رمضان

سب سے بڑا تصنیفی کارنامہ

محدث دکن کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی عظیم الشان تصنیف ''زجاجۃ المصابیح'' ہے جو کہ علامہ خطیب تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کی مشکوۃ المصابیح کے طرز پر ترتیب دی گئی ہے، فرق یہ ہے کہ مشکوۃ المصابیح میں فقہ شافعی کی رعایت رکھی گئی تھی جبکہ زجاجۃ المصابیح میں فقہ حنفی کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔اور حاشیہ پر فقہ حنفی پر کئے جانے والے اعتراضات کے مدلل جواب اور حنفی فقہ کی خصوصیات کی وضاحت کی گئی ہے۔

اس کتاب کو بالعموم سارے عالم میں اور بالخصوص حیدرآباد اور دیوبند وسہارنپور کے حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور درس حدیث میں اب بھی اساتذہ اس کے حوالے دیتے ہیں نیز مختلف رسائل میں اس پر حوصلہ افزاء تبصرے شائع ہوئے حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے ماہنامہ میں صدق جدید میں اس کی تعریف فرمائی ہے۔

محدث دکن کی اردو تصانیف میں کچھ تو خالصۃً تصوف وسلوک پر مبنی ہیں جبکہ بقیہ اصلاحی وتذکیری نوعیت کی ہیں ان میں سے بعض ان کے مواعظ وخطبات کا مجموعہ بھی ہیں۔ان کی ان تصانیف میں اور خاص کر مواعظ میں ہمیں انسانی کردار سازی کے عناصر وافر مقدار میں ملتے ہیں، ہم یہاں پر مختلف عنوانات کے تحت ان کی تحریروں اور تقریروں میں پائے جانے والے کردار سازی کے عناصر سے بحث کریں گے۔

آخرت کی فکر انسانی کردار کی پاکیزگی کے لئے لازمی ہے

انسان کی کردار سازی کے لئے محدث دکن حضرت عبداللہ شاہ رحمۃ اللہ

علیہ فکر آخرت کو لازمی قرار دیتے ہیں، اس کے لئے وہ نئے نئے پیرایہ سے سامعین اور قارئین کو اپنے اندر فکر آخرت کو پیدا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، آپ کی اس سلسلہ میں ایک تحریر کا دلچسپ اقتباس ملاحظہ ہو:

جو لوگ فکر آخرت پر دنیا کو ترجیح دیتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے جنین ماں کے پیٹ کو ایک پر فضاء عالم سے اچھا اور وہاں کے خون کو بہترین غذا سمجھتا ہے، اسی طرح جو لوگ ناپائیدار دنیا کو اپنا گھر سمجھ کر اس کی لذتوں پر مرمٹتے ہیں اور دنیا کی مال و دولت کو عیش جاودانی سمجھ کر آخرت کو بھولے ہوئے ہیں اور اپنی عادت وخواہشات سے باز نہیں آتے، ان لوگوں کو آخرت کا چسکا ہی نہیں ہے۔ مواعظ حسنہ، صفحہ:۳۶

تعلق مع اللہ

انسان کی فطرت سلیمہ کے مسخ ہونے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ وہ اللہ کے دربار کو چھوڑ کر دردر خوار ہوتا پھرے، خالق تو ہمیں اپنانا چاہے مگر ہم اس سے بے نیاز ہو جائیں، جس کے نتیجہ میں ذلت ورسوائی کا سامنا ہو۔ حضرت محدث دکن اپنی تحریروں میں اکثر جگہوں پر سب کو چھوڑ کر ایک خدا کو اپنانے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں ملاحظہ کیجئے ان کا ایک اقتباس:

> ''اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا بنانا چاہتے ہیں، اس لئے انہیں چھوڑ کر دوسروں کے پیچھے دربدر نہ پھریں، اور نہ ان کی نافرمانی سے اپنی عاقبت برباد کریں، جیسے ہم ایک خدا کو ماننے والے ہیں ایسے ہی اگر ایک خدا کے بھی ہو جائیں تو ہمیشہ چین واطمینان

سے رہیں گے، اس وقت ہمیں ایسا اطمینان ہوگا جیسے بچہ ماں کی گود میں بالکل مطمئن اور بے فکر ہو جاتا ہے، اس لئے ہر حال میں اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری کرتے رہو تو وہ خود بخود اپنا بنا لیتے ہیں۔" (مواعظ حسنہ، صفحہ: ۴۱-۴۲)

اللہ اور اس کے رسول کے احکام میں شبہ

آج کے اس شکوک وشبہات اور الحاد و بے دینی اور انسانوں کی پستی کے اس ماحول میں امت کا ایک داخلی فتنہ یہ بھی ہے کہ سنتوں میں مصلحتیں تلاش کی جائیں اور جن سنتوں کی مصلحتیں سمجھ میں آئیں ان کا اہتمام ہوا اور جن کی نہ سمجھ میں آئیں ان کو ترک کیا جائے، محدث دکن کا خیال ہے کہ اللہ اور رسول کے احکام پر انسان کو بغیر مصلحتیں ڈھونڈھے عمل کرنا چاہئے اگر ایسا نہ ہوگا تو بڑی محرومی کی بات ہوگی، اور حقیقی کردار کے حصول سے محروم رہیگا۔ ان احکامات پر عمل کی طاقت حاصل کرنے کے لئے وہ اپنے اندر محبت الٰہی اور محبت رسول کے پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں ان کا یہ اقتباس:

"محبت اگر کسی عورت سے ہو جائے اور وہ کہے کہ اپنا کرتا نکال کر سر بازار برہنہ نکل جاؤ تو میں تم سے خوش ہوں گی، وہ شخص اگر محبت میں پکا ہے تو کبھی یہ نہ پوچھے گا کہ اس میں کیا مصلحت ہے، بلکہ یوں کہے گا کہ میرے محبوب نے اپنے راضی ہونے کی ایک صورت تو نکالی، مجھ کو وجہ دریافت کرنے سے کیا غرض؟ محبت کی تو بڑی مصلحت محبوب کا راضی کرنا ہے۔ جب

مردار عورت کی محبت میں یہ حال ہے کہ اس کے احکام کی وجہ دریافت نہیں کی جاتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا کیا پوچھنا، اگر ہم کو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعی محبت ہے تو ہم کو حضرت کے احکام کی وجہ پوچھنے کی کیا ضرورت، یہ تو دیکھو کہ یہ احکام کس مقدس ذات کے ہیں..... بڑا بدنصیب ہے وہ شخص جو ایسے نبی کی برکات سے محروم رہے۔"

(میلاد نامہ، صفحہ:۴۱)

توکل

انسانی کردار سازی میں "توکل علی اللہ" کا ایک بہت بڑا حصہ ہوتا ہے کہ بندہ کو اللہ پر کامل یقین اور بھروسہ ہو، توکل کی وہ شکل کہ انسان سارے اسباب کو چھوڑ کر صرف اللہ کے بھروسہ زندگی گذارے محدث دکن کے نزدیک مناسب نہیں ہے وہ فرماتے ہیں:

"بابا! توکل بھی ایک کٹھن منزل ہے، ہر ایک کے لئے ترک اسباب بجائے فائدہ کے نقصان دہ ہے، اس زمانہ میں توکل یہی ہے کہ اسباب کرتے رہیں، مگر نظر اسباب پر نہ رہے، بلکہ ہمیشہ مسبب الاسباب پیش نظر رہے..... نوکری بھی کریں خاص کر ایسی نوکری جو حلال اور مباح ہو اور ادھر دین داری میں اعلیٰ نمونہ بن کر مخلوق کے سامنے پیش ہوں تاکہ ہر شخص بے ساختہ کہے کہ یہ دنیا نہیں ہے سراسر دین ہی ہے، زبان خلق نقارہ

خدا ہے، خالق بھی کہے گا کہ میرا بندہ بظاہر دنیا مگر حقیقت میں دین داری کر رہا ہے"۔ (۸۴۔۸۵۔مواعظ حسنہ)

جذبات انسانی

انسانی کردار سازی کے سلسلہ میں دنیا میں یہ کوشش بھی ہوئی ہیں کہ چونکہ انسان کے جذبات اور خواہشات ہی ہیں جو کہ اسے برائی کی طرف لے جاتے ہیں اور اس کی شخصیت کو مسخ کر دیتے ہیں اس لئے ان جذبات اور خواہشات ہی کو ختم کر دیا جائے کہ "نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری" چنانچہ عیسائیوں اور ہندوؤں کے یہاں انسانی کردار سازی کے لئے اس قسم کی شکلیں اب بھی ملتی ہیں، حضرت محدث دکن اس سوچ کے سخت مخالف ہیں وہ فرماتے ہیں:

"انسان میں جتنے جذبات ہیں گو بظاہر برے معلوم ہوتے ہیں مثلاً غصہ، خواہشات وغیرہ، غصہ کے برے نتائج نکلتے ہیں اور خواہشات سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، حرص وطمع اور سارے برے اخلاق انہی جذبات کے زیر اثر ہیں، دیگر مذاہب والوں نے انہیں مٹانے کی کوشش میں کسی نے ہاتھ سکھا دیا، کسی نے شہوت کم کرنے کی تدبیر کی۔ گرجاؤں کی راہبات اور مندروں کی مرلیاں بھی انہی اغراض کے تحت بنائی گئی ہیں، ہمارے بعض جہلاء نے بھی ان جذبات کو مٹانا چاہا، مجاہدہ کے بعد جب دیکھا کہ وہ جذبات نہیں مٹتے تو انہیں بے حد افسوس ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو خطبہ چھوڑ کر حضرت حسینؓ کو گود

میں اٹھالیں اور یہ جہلاء اہل وعیال کو دیکھنا تک پسند نہ کریں اور اس کو گناہ سمجھیں، یہ اسلامی تعلیمات نہیں ہیں، اسلام فطرت کے موافق ہے، فطری چیزیں کہیں مٹانے سے مٹ سکتی ہیں؟ .....اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ان جذبات کو نہ مٹائیں بلکہ دبائے رکھیں، کیونکہ ان جذبات میں بھی بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں، اگر غصہ نہ ہو تو عفو کی فضلیت کیسے ملے، صبر و بردباری کیسے حاصل ہو، یہ سب غصہ کو دبانے سے حاصل ہوتے ہیں۔ ایسے ہی خواہشات نہ ہوں تو تقویٰ کیسے حاصل ہو؟ انہی کو دبانے کا نام تو تقویٰ ہے۔" (مواعظ حسنہ صفحہ: ۹۵-۹۶)

خواہشات پر کنٹرول کے لئے محدث دکن بڑا زور دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ شیطان خواہشات کی راہ سے انسان کو اپنے چنگل میں لے لیتا ہے اور نفس امارہ کی مدد سے جو کہ گھر کا بھیدی ہے انسان پر غلبہ پاتا ہے اس لئے نفس کی یعنی اندرونی دشمن کی مخالفت کر کے بیرونی دشمن سے نمٹنا چاہئے۔

(سلوک مجددیہ، صفحہ: ۱۱۷)

آپسی اتفاق اور محبت

بالعموم انسانوں کا اور بالخصوص مسلمانوں کا تقریباً ہر جگہ یہ المیہ ہے کہ ان میں اتفاق نہیں ہے، بلکہ انتشار و افتراق ہے، ہر دانشور مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے پر زور دیتا ہے، آیئے دیکھیں اس سلسلہ میں محدث دکن کیا کہتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

"اتفاق جب ہی ہوسکتا ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو

سب سے کمتر سمجھے اور جو کچھ تکلیف یا ایذاء پہنچے اس کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے جانے، تب کہیں جا کر یہ کمبخت نفس فرمانبردار ہوتا ہے، ایمان اور اعمال صالحہ سے اللہ تعالیٰ آپس میں محبت واتفاق پیدا کرتے ہیں۔ ایمان کو مستحکم کر لیجئے اور اعمال صالحہ کا اہتمام، تو خود بخود حقیقی اتفاق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے سواء اگر اتحاد ہو تو سمجھ لیجئے کہ وہ محض ایک ڈھانچہ ہے جس میں روح اتفاق نہیں ہے"۔ (مواعظ حسنہ ص۔۳۳)

امر بالمعروف ونھی عن المنکر: کسی بھی انسان کی صحیح کردار سازی اسی وقت مکمل ہو سکتی ہے کہ جب اسے اچھے کاموں کی ترغیب دی جائے اور برے کاموں سے روکا جائے، لیکن اس سلسلہ میں محدث دکن خلوص نیت اور صحیح طریقہ کار کے اختیار کرنے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں ان کا کہنا ہے:

"امر بالمعروف میں خلوص نیت کا زیادہ اثر ہے، ہم اپنی طرف سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ایسا طریقہ نہ اختیار کریں جس سے کوئی خفا ہو جائے، اگر ہمارے اچھے طریقہ پر بھی کوئی خفا ہوتا ہے تو ہونے دیجئے، اس کی پروا نہیں۔ ہمیں تو خدا پر نظر رکھنا اور صرف اس کی رضاء کا طالب ہونا چاہئے۔"

(مواعظ حسنہ، ص:۴۴)

ضروریات اور اسباب زندگی

انسان کے پاکیزہ رہنے کے لئے وہ لازمی قرار دیتے ہیں کہ انسان کی زندگی کی ضروریات مختصر ہوں اور اسباب کے مختصر ہونے سے ہلکا پھلکا ہو فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام چیزیں اور اسباب زینت وغیرہ انسان کی سہولت وآرام کے علاوہ آزمائش کے لئے بھی بنائے ہیں کہ دیکھیں کون ان پر فریفتہ ہوکر ہم سے منہ موڑتا ہے، اس لئے جہاں تک ہو سکے اسباب دنیوی مختصر رکھ کر ضروریات زندگی کی تکمیل کیا کرو، بقدر ضرورت اسباب پر اکتفا کر کے اپنی آخرت سنبھالو اور اللہ تعالیٰ سے محبت بڑھاو، دیکھو خواہشات نفسانی کے خلاف کرنے والوں کا ٹھکانہ جنت ہے۔.....دنیوی اسباب جس قدر بڑھتے جاتے ہیں حرص بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے، دنیا مثل کھارے (نمکین) پانی کے ہے جتنا پیو گے، اسی قدر پیاس زیادہ ہوتی رہے گی۔''

شیطانی وساوس: محدث دکن اپنی تقریروں اور تحریروں میں اکثر وبیشتر شیطانی وساوس کا تجزیہ کرتے اور ان سے بچنے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں دیکھئے توبہ کے سلسلہ میں عام طور پر پیدا ہونے والے ایک وسوسہ کے سلسلہ میں وہ کیا فرماتے ہیں:

''بعض کہتے ہیں کہ توبہ کے بعد پھر گناہ ہوگا اس لئے توبہ سے کیا فائدہ؟ ان سے کہہ دیا جائے کہ بیماری کا علاج کروانے کے بعد اور بیماری آتی ہے تو پھر علاج کیوں کروایا جائے؟ یہ وسوسہ شیطانی ہے، شیطان آپ کو توبہ سے محروم رکھنے کے لئے اس قسم کا وسوسہ پیدا کرتا ہے، ہر وقت کوشش کیجئے کہ گناہ نہ ہونے پائے، احیاناً گناہ ہو جائے تو پھر توبہ کر لیجئے''۔

(مواعظ حسنہ ص:۷۸)

رد بدعات

محدث دکن مولانا عبداللہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حیدرآبادی عالم ہیں اور حیدرآباد کے ماحول میں شیعی اثرات کی وجہ سے کافی بدعات پائی جاتی ہیں اس کے باوجود وہ ظاہر شریعت کے زبردست پابند تھے اور وہ باتیں جو ظاہر شریعت سے ٹکراتی ہوئی نظر آتی ہیں اکثر و بیشتر ان پر سخت نکیر کیا کرتے تھے حیدرآباد دکن کے بعض مشائخ میں تدفین کے وقت قبر میں شجرہ رکھنے کا رواج تھا اس پر محدث دکن کہتے ہیں:

> ''قبر میں شجرہ رکھنا خلاف ادب ہے، اکثر مشائخ کرام کے یہاں قبر میں شجرہ رکھنے کا عملدرآمد ہے، مگر میرے نزدیک مرنے کے بعد قبر میں شجرہ رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ ان بزرگوں کی (جو شجرہ میں ہیں) سچی اتباع کر کے مریں، جو شجرہ کے حروف سے بڑھ کر ہے اور یہ دل میں کھدا ہوا شجرہ نہایت کارآمد ہوتا ہے۔''

اسی طرح حیدرآباد دکن میں ''چلوں'' کا بڑا رواج ہے، حیدرآباد میں چلّہ ایک مخصوص طرز کے چبوترے کو کہتے ہیں جس پر ہرا رنگ کر دیا جاتا ہے اور کچھ جھنڈے باندھے جاتے ہیں، عام مسلمان بڑی عقیدت سے وہاں جاتے ہیں اور ان چلوں سے بڑا والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں اور بالعموم انہیں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے منسوب کر کے غوث پاک کے چلے کہا جاتا ہے، اور یہ ایک عام تصور ہے کہ جو ان چلوں کے خلاف بولے گا وہ وہابی ہے، خارج از اہل سنت والجماعت ہے مگر محدث

دکن رحمۃ اللہ علیہ صاف انداز میں ان سے دور رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے وہ فرماتے ہیں:

"چلوں کی زیارت کرنا یا ان پر فاتحہ پڑھنا بالکل جائز نہیں ہے۔چلوں پر ہرگز نہ جائیں۔" (مواعظ حسنہ ص:۱۷۱)

محدث دکن کی تقریروں وتحریروں کے مصادر ومراجع

ان کی تحریروں وتقریروں کے بنیادی مصادر قرآن وسنت ہیں، وہ جگہ جگہ قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ کے حوالوں سے گفتگو کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی کہی ہوئی بات بڑی مدلل ہوتی ہے۔معاصرین میں وہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ سے بھی متاثر ہیں اور ان کے بھی اقوال اکثر وبیشتر نقل کرتے ہیں۔اس کے علاوہ صوفیاء کرام کی کتابوں سے احکایات واقوال بڑی تعداد میں نقل کیا ہے۔

محدث دکن کی تحریروں اور تقریروں کا ادبی معیار: محدث دکن کی اردو تحریروں اور تقریروں میں ہمیں سلاست وروانی چھوٹے چھوٹے سادہ جملے، اور فکر وخیال کا عمدہ اظہار ملتا ہے، اور بعض جگہوں پر ٹھیٹھ دکنی انداز بیان بھی، تاہم آپ کی تحریروں کو ہم خالص ادبی اسلوب نہیں کہہ سکتے ہیں، بنیادی طور پر وہ ایک بزرگ تھے، داعی اللہ تھے اور زبان کو انہوں نے اپنے خیالات کی ترسیل اور اشاعت احکام الٰہیہ کا ذریعہ بنایا تھا البتہ ان کی زبان کے معیار کو ہم متوسط درجہ ضرور دے سکتے ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ انسانی کردار سازی کے جو اسلامی پہلو ہیں وہ ہمیں محدث دکن کی تحریروں اور تقریروں میں ایک بڑی تعداد میں جا بجا نظر آتے ہیں ان کی تحریروں

اور خطبات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مسلم سماج سے متعلقہ تقریباً تمام مسائل پر غور کیا ہے اور ان کی اصلاح کی بھرپور کوشش فرمائی۔ چونکہ ان کی عملی زندگی اسلامی تعلیمات کا آئینہ دار تھی انہیں اسلامی اقدار کا پاس تھا، ان کی حمیت ایمانی مثالی تھی اور آپ کا قلب ملت اسلامیہ کی زبوں حالی پر بے چین تھا اس لئے آپ کی تقاریر اور تحریروں میں ایک عجیب طرح کی تاثیر محسوس ہوتی ہے جو دل و دماغ پر اثر انداز ہو کر سوچنے پر مجبور کرتی ہیں، آپ کے اس دنیائے فانی سے پردہ فرما جانے کے اتنے سالوں بعد بھی جب ہم آپ کی تحریروں اور تقریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو قلب و روح کی حالت عجب ہونے لگتی ہے، اس اعتبار سے اگر یہ کہا جائے کہ دکن اور اس کے اکناف کے مسلمانوں کی کردار سازی میں محدث دکن کی تحریروں اور تقریروں کا ایسا رول رہا ہے کہ جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے تو بالکل بے جا نہ ہوگا۔

مولانا مہتاب عالم رشادی ندوی

شاعر مشرق علامہ اقبال
اور مغربی تہذیب پر سخت تنقید

۱۹ویں صدی کے آواخر اور ۲۰ویں صدی کے اوائل کا زمانہ بڑا انقلاب آفریں زمانہ رہا ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مسلم نوجوانوں میں امنگ اور جوش وولولہ پیدا ہوا، اس نے ان کو مغربی علوم سے بہرہ مندہ ہونے پر مہمیز کیا، اس کے نتیجہ میں وہ یورپ کے مشہور یونیورسٹیوں کا رخ کرنے لگے، ان کی اس علمی پیش رفت سے جہاں انھیں ایک فائدہ یہ پہنچا کہ ان کے قلوب سے ایک فاتح قوم کا خوف اور دہشت نکل گئی، آپس میں روابط بڑھے، ثقافتی تعلقات کو ایک جہت ملی، تو دوسری طرف مغربی تہذیب سے بے حد متاثر ہوئے مغربی تہذیب کو ایک آئیڈل اور ترقی کا مژدہ سمجھ لیا، لہٰذا وہ مغرب کے آلہ کار بن گئے اور اپنے ایمان وعقیدہ اور ضمیر کو فراموش کر دیا۔

لیکن انھیں نوجوانوں میں کچھ ایسے بھی ہوئے جنھوں نے یورپ میں تعلیم حاصل کی اور وہاں کی تہذیب کا غائرانہ مطالعہ کیا اور اس کے حسن وقبح کو اچھی طرح پرکھا یہاں تک کہ اس موقف پر پہنچے کہ مغربی تہذیب ایک مردہ تہذیب ہے، ایک جسم ہے جس میں روح نہیں، ایک شجرۂ خبیثہ ہے جس کی جڑیں زمین پر ظاہر ہو رہی

ہیں جس کا کوئی قرار وثبات نہیں۔جس میں نہ راستہ چلنے والوں کے لئے سایہ ہے اور نہ پھل،اس کے مقابلہ میں انھوں نے اپنے آپ کو دیکھا،اپنے ایمان وعقیدہ کو دیکھا اور اپنی تہذیب پر نظر دوڑائی تو ایک شجرۂ طیبہ پایا جس کی شاخیں آسمان کی بلندیاں چھورہی ہیں اور اس کی جڑ مظبوطی کے ساتھ زمین میں ثابت ہے۔

ان نوجوانوں میں سرفہرست اور صف اول میں حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمہ کی مردانہ وار شخصیت ہے،جو مغربی تہذیب وتمدن کے بحرزخّار میں بے خوف وخطر کود پڑتے ہیں اور غوطہ زنی کرکے اس کی تہہ سے درّ بیش بہا نکال لاتے ہیں لیکن اس بحر کی طغیانی اور تلاطم سے ذرہ برابر بھی متاثر نہیں ہوتے۔

علامہ اقبال پنجاب کے شہر سیالکوٹ ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے،ان کا خاندان کشمیری برہمنوں کا خاندان تھا،ان کے جداعلیٰ دوسوسال قبل حلقہ بگوش اسلام ہوئے،اوراسی وقت سے صلاح وتقویٰ کا رنگ خاندان میں قائم رہا،خود اقبال کے والد ایک صوفی صافی انسان تھے۔

علامہ اقبال ملت اسلامیہ کے عظیم الشان شاعر ہیں،ان کی شاعرانہ عظمت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا،انھوں نے اردو اور فارسی شاعری کو فکر وفلسفہ کے فن کارانہ اظہار وابلاغ سے آشنا کیا،وہ صحیح معنوں میں ترجمان حقیقت ہیں،انھوں نے انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے اور شاعری کو اپنے فکر وفلسفہ سے عظیم تر بتایا،عظمت انسانی ان کا خاص موضوع ہے،خود کو وہ انسانی عظمت کے لئے لازمی قرار دیتے ہیں،اور افرادِ ملت میں خودی کو پیدا کرنا ان کا نصب العین ہے،ان تمام موضوعات کی تفصیلات ان کی شاعری کا موضوع ہیں،اور ان کو پیش کرنے کے لئے انھوں نے اپنی شاعری میں ایسا اسلوب پیدا کیا ہے جو ان

کے فن کارانہ عظمت پر دلالت کرتا ہے۔

اقبال کے یہاں مغربی تہذیب کے متعلق زیادہ تر مخالفانہ تنقید ہی ملتی ہے، اور یہ مخالفت اس کے رگ و پے میں اس قدر سرایت کی ہوئی تھی کہ وہ اپنی اکثر نظموں میں وقفہ وقفہ سے فرنگ پر ایک کاری ضرب رسید کر دیتا ہے۔

اپنی غزلوں میں بھی حکمت و عرفان، تصوف اور ذوق وشوق کے اشعار کہتے کہتے یوں ہی ایک آدھ ضرب مغرب کو رسید کر دیتے ہیں، کہیں ملا کو برا کہتے ہیں جو تہذیب فرنگ کی طرف اقبال کے طعن وطنز کے تیروں کا ایک مستقل ہدف ہے تو اس کے ساتھ ہی فرنگ کو بھی لپیٹ میں لیتے ہیں، حالانکہ باقی اشعار نہایت حکیمانہ اور عارفانہ ہوتے ہیں مثلاً غزل کا یہ مطلع:

اک دانش نورانی، ایک دانش برہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

مگر یورپ میں جو ظاہری حسن و جمال اور پاکیزگی ہے اقبال بصمیم قلب اس کے معترف ہیں لہٰذا تہذیب افرنگ کے اس حسین پہلو کو جس نے انھیں ایشیا کی بالیدگی سے نکال کر پوری دنیا میں ممتاز کیا، اقبال اسے قابل رشک سمجھتے ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ مشرق میں بھی جنت ارضی کے نمونہ نظر آئیں:

فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا
نہ آبلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اگر اقبال بعض وقت مغربی تہذیب کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف مشرق کو بھی کھری کھوٹی سنانے سے گریز نہیں کرتے، لہٰذا وہ مشرق کی جھوٹی روحانیت سے بھی بیزاری ظاہر کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ فرنگ

کو بھی گرفت میں لینے سے باز نہیں رہتے اور کچھ اس طرح گویا ہوتے ہیں:

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا

اقبال فرنگی تہذیب کے عاجزی و درماندگی اور اس کی بنیادی کمزوریوں کے اس مادی فساد اور بے راہ روی بخوبی محسوس کر چکے اور اس کا مشاہدہ بھی کرلیا، انھوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ مغربی تعلیم و تربیت کا پروردہ اور اس تہذیب کی کھلی فضاؤں میں اپنی زندگی گذارنے والا اپنے دین اور اپنے اقدار و مثل سے کس قدر برگشتہ ہوتا ہے، اس کے قلب و نظر صفائی کو اس تہذیب کی روح کی ناپاکی کس طرح مکدر کرتی ہے اور اس سے قلب سلیم کی دولت سلب کر لیتی ہے:

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ناامید
ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

وہ کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب کے زیر سایہ جو دائمی بے چینی اور اضطراب ہے اس تہذیب کی رعنائی اور حکومت کی وسعت و اقتدار اور دور کرنے سے قاصر ہے، روزانہ وجود میں آنے والی نئی نئی مشینیں، برق و بخارات جو دھند کی طرح آسمان کی فضاؤں میں منڈلاتے نظر آتے ہیں، بجلی کی روشنی ہے لیکن اس سے کوئی فکری اور ذہنی ضیا پاشی نہیں ہو پا رہی ہے، اور نہ عالم غیب ہی کی کوئی جھلک اس میں ملتی ہے:

یہ عیش فراواں یہ حکومت یہ تجارت
دل سینۂ بے نور میں محروم تسلی

تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادیٔ ایمن نہیں شایان تجلی
ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اپنی کتاب نقوش اقبال میں اقبال کے مغربی تہذیب کے تئیں ان کے نظریات کو اجاگر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اس تہذیب میں عقل پروان چڑھتی ہے لیکن محبت اور انسانی جذبات اسی حساب سے مرجھا جاتے ہیں اور دم توڑتے رہتے ہیں، اس تہذیب سے بڑے انقلابی اور ترقی پسند بھی رسم وراہ عام کی پابندی اور محدود دائروں کی حد بندی سے نہیں نکل سکتے، اور ان کا انقلابی ذہن انقلاب میں تقلید پسند ہی رہا۔'' (نقوش اقبال: ص ۷۵)

مغرب پر تنقید وتجزیہ کے لئے ان کی کتاب ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں بہت سی تصریحات ملتی ہیں، ذیل میں ہم ان کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جس میں وہ مغرب کی مادی تہذیب اور اس کے پیدا کردہ مشکلات ومسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حاصل کلام یہ کہ عصر حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ان کے زیر اثر انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے، یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے، خیالات اور تصورات کی جہت سے دیکھئے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے

متصادم ہے، سیاسی اعتبار سے نظر ڈالئے تو افراد افراد سے دست وگریباں ہیں اس میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور نا قابل تسکین جوع زر پر قابو حاصل کر سکے، یہ باتیں ہیں جن کے زیر اثر زندگی کے اعلیٰ مراتب کے لئے اس کی جدو جہد بتدریج ختم ہو رہی ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ درحقیقت زندگی ہی سے اکتا چکا ہے، اس کی نظر حقائق پر ہے، یعنی اس کے سرچشمے پر جو اس کی آنکھوں کے سامنے ہے، لہذا اس کا تعلق اپنے اعماق وجود سے منقطع ہو چکا ہے، اور پھر جیسا کہ ہکسلے کو بھی خدشہ تھا اور جس کا بلا تأسف وہ اظہار بھی کر چکا ہے، مادیات کی اس باقاعدہ نشو نما نے اس کے رگ و پے بھی مفلوج کر دئے ہیں اور ایسی ہی حقیقت مشرق کی ہے۔"

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ)

اقبال کا اس بات پر کامل ایمان ہے کہ مغربی تہذیب موجودہ دور میں ممالک اسلامیہ کو ترقی کی راہ پر ہرگز گامزن نہیں کر سکتی، اور ان کے درپیش مسائل کا صحیح حل پیش کر سکتی ہے، نہ تو ان میں نئی زندگی کی کچھ روح ہی پھونک سکتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ "جو تہذیب اپنی موت آپ مر رہی ہے وہ دوسروں کو زندگی کب دے سکتی ہے۔" ع

خفتہ را خفتہ کے کند بیدار
نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومی وتقلید سے کور

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیوں کر
یہ فرنگی مدنیت کے جو ہے خود لب گور

مغرب کا ہمیشہ سے یہ شیوہ رہا ہے کہ اس نے مشرق کے بے پناہ احسانات کا بدلہ احسان فراموشی سے دیا ہے، اس کے یہاں شکران نعمت نہیں بلکہ کفران نعمت کا مادہ پایا جاتا ہے، انھوں نے ہمیشہ بھلائی کی جزا برائی سے دیا ہے، شام جس نے مغرب کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کا پیام عفت وعصمت اور غم خواری ورحمت، برائی کے بدلے بھلائی، ظلم کے مقابلے میں عفوو درگذر کا درس دیا اسی شام پر جب مغرب نے ظالمانہ وجابرانہ قبضہ کیا تو قبضہ کے دور ان خمر وقمار، بے پردگی اور آوارگی وعیاشی کے سوا کوئی صلہ نہیں دیا:

فرنگیوں کو عطا خاک سوریا نے کیا
نبی عفت وغم خواری وکم آزاری
صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لئے
مے وقمار وہجوم زنان بازاری

اسی طرح علامہ اقبال نے مغربی تہذیب کی بھول بھلیوں میں پھنس کر مغرب کا ترانہ گانے والوں اور تجدد کے علمبرداروں کو بھی آڑے ہاتھ لیا ہے، لہذا ان کی مشرق میں تجدد پر سخت تنقید کی ہے۔ انھوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ تجدید کی دعوت کہیں تقلید فرنگ کا بہانہ اور پردہ نہ ہو، اور ہوا ایسا ہی وہ لوگ جو مغرب کے خوشا چیں تھے وہ اس کے نرے مقلد بن گئے:

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

اقبال کی شخصیت ان چند غیور وجسور اور باحمیت وغیرت افراد میں سے ایک ہے جنھوں نے مغرب کو بہت قریب سے دیکھا اور اس کے معائب کو اس کے محاسن سے الگ کیا اور ہمیشہ اپنی ملت کو اس بات سے باخبر کرتا رہا کہ تم کبھی ان فرنگیوں کی تہذیب کو نہ اپنانا بلکہ ہمیں اسلامی تہذیب وشعائر میں اپنے لئے ہمیشہ جادۂ راہ تلاش کرنا چاہئے۔

اخیر میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی کتاب نقوش اقبال جو روائع اقبال کا بہترین اردو ترجمہ مع ترمیم واضافہ ہے) کا اقتباس نقل کرتے ہوئے اس بحث کو یہیں سمیٹنے کی کوشش کریں گے، مولانا اقبال کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> ''اقبال ان معدودے چند خوش قسمت افراد میں سے ہیں جو مغربی تعلیم کے سمندر میں غوطہ لگا کر ابھر آئے اور نہ صرف یہ کہ صحیح سلامت ساحل تک پہنچے بلکہ اپنے ساتھ بہت سے موتی تہ سے نکال کر لائے اور ان کی خود اعتمادی، اسلام کی ابدیت! اور اس کے وسیع مضمرات پر ان کا یقین اور زیادہ مستحکم ہوگیا، اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے مغربی تعلیم اور فلسفہ کا مطلق اثر قبول کیا اور ان کا دینی فہم کتاب وسنت اور سلف امت کے بالکل مطابق ہے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس آتش نمرود نے ہزاروں معاصرین کی طرح ان کی خودی اور شخصیت کو جلا کر خاک نہیں کیا اور بڑی حد تک ان کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ:
>
> طلسم علم حاضر را شکستم
> ربودم دانہ ودامش گسستم

خدا داند کہ مانند ابراہیم
بنار اوچہ بے پروا نشستم

(نقوش اقبال ص ۸۳۔۸۴)

مراجع وماخذ

۱۔اقبال کامل

۲۔روح اقبال

۳۔فکر اقبال

۴۔نقوش اقبال

۵۔تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ

پروفیسر سید ضیاء الحسن (مرحوم)

جدید عربی نثر اور اس کے مختلف رنگ

عربی نثر اسماعیل باشا کے عہد تک صنائع وبدائع کی ان بیڑیوں میں جکڑی ہوئی تھی جو اسے کمزور اور غلامی کے عہد سے ورثہ میں ملی تھیں، ترکی، یورپی اور عامی الفاظ وتعبیرات نے اسے اور بھی رکیک بنا دیا تھا جس میں مقصد ومعنی اور تخیل کا رنگ اگر مفقود نہیں تو بالکل پھیکا ہو کر رہ گیا تھا۔ نثر کا دائرہ دفتری اور سرکاری خطوط اور دوستوں کی باہمی خط وکتابت میں محدود تھا۔

اسماعیل باشا کے زمانے میں ادبی نشأۃ ثانیہ کا آغاز ہوتا ہے اور مغربی تہذیب اور ادب ترجمے کے ذریعے عربی زبان میں منتقل ہونا شروع ہوتا ہے۔ دوسری طرف عربی کے قدیم ادبی شاہکار نئے زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر بہ آسانی لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچتے ہیں۔ مختلف دینی ادبی اور قومی اجتماعات میں زبان وبیان کے نئے نئے اسلوب سامنے آتے ہیں۔ وقت کی تیز رفتاری اور صنعتی دور کی روز افزوں مشغولیت قاری وسامع کو اتنا موقع نہیں دیتی کہ وہ تشبیہات واستعارات مبالغہ وکنایات سے بوجھل کسی تحریر کو پڑھنے اور کسی تقریر کو سننے کا وقت نکال سکے۔ چنانچہ تحریر کی یہ زنجیریں خود بخود کٹنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ معانی وخیالات میں گہرائی، اسلوب میں سادگی اور روانی پیدا ہوتی ہے اب کسی بھی مضمون

میں طولانی تمہید یا پر تکلف اختتام برداشت نہیں کیا جاتا۔ نیز افسانے، ناول، سوانح وبیانیہ مقالات اور تنقیدی مضامین میں سب میں راستی وراست بازی ہی تلاش کی جاتی ہے۔ عربی نثر کے اس نئے طرز کے علم بردار عبداللہ باشا فکری، جرجی زیدان، ابراہیم بک مویلحی اور مصطفیٰ منفلوطی ہیں۔ اس طرح صحافتی نثر بھی صنائع بدائع کے تکلفات سے آزاد رہی۔ شیخ علی یوسف، محمد عبدہ اور فتحی زغلول اس طرز تحریر کے نمایاں لکھنے والے ہیں۔ نثر کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ نثر فنی

۲۔ نثر علمی

نثر فنی: فنی نثر اس ادبی تحریر کو کہا جاتا ہے جس میں لکھنے والا اپنی تحقیقی صلاحیتوں سے کام لیتا ہے اور جس میں اس فکر وخیال کی کارفرمائی ہوتی ہے جس میں زبان وبیان کی نزاکتوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ نثر کی ایسی ترقی کے بہت سے اسباب ہیں جن میں چند خاص اسباب کچھ اس طرح ہیں۔ عربی زبان وادب کے مطالعے کی طرف بڑھتی ہوئی توجہ، جامع ازہر اور اس سے متعلق مدارس ومعاہد میں زبان کی صحت وسلامتی اور اس کے خالص عربی کے اسلوب کی حفاظت کا اہتمام، قدیم عربی ادبی مصادر کا احیاء اور معاصر ادیبوں کی تصنیفات کی طباعت، ادبی رسائل کا اجراء، روزناموں اور اخباروں میں ادبی مضامین کی اشاعت، دارالکتب المصریہ کا قیام اور مغربی ادب کے عربی ترجمے، عوامی انقلابی تحریکوں کی کثرت جن میں خطابت کی ضرورت ہوتی تھی اور اخبارات ورسائل میں ادبی تحریروں کی اشاعت جس کے نتیجہ میں عام پڑھے لکھے لوگوں کی رسائی بھی ادبی شہ پاروں تک ہونے لگے۔

فنی نثر کی نشو ونما میں مصر کے شہرۂ آفاق مصلح اور ادیب محمد عبدہ کا حصہ ناقابل فراموش ہے۔مصر کے اکثر رہنما ان کے شاگرد تھے جن میں سعد زغلول، مصطفیٰ عبدالرازق، احمد لطفی السید، مصطفیٰ المراغی اور طواہری قابل ذکر ہیں۔محمد عبدہ اپنے زمانے میں انشاء پردازوں کے امام سمجھے جاتے تھے۔خود وہ ابن العمید، ابن خلدون اور جاحظ کے اسلوب سے بہت متاثر تھے۔البتہ انتہائی ضروری مواقع کو چھوڑ کر عبارت کے سجع وقافیہ کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔الفاظ کا شکوہ، معانی کی باریکی، فکر کا منطقی تسلسل اور نظم وترتیب کی پختگی ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے۔محمد عبدہ جدید نثری اسلوب کے امام کہے جاسکتے ہیں۔انھوں نے نثر میں صنائع وبدائع کے استعمال کی مخالفت کی اور نثری تحریروں میں سادگی، روانی، مفہوم ومعنی کی سچی اور واضح تعبیر کی وکالت کی۔ان کے نزدیک غیر عربی الفاظ اور سقیم اصطلاحات کا استعمال ایک عیب تھا۔وہ زبان کو صنائع وبدائع اور تکلف سے پاک دیکھنا چاہتے تھے۔

ہمارے اس زمانے میں نثری تحریروں کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اسلوب کی وضاحت سہل نگاری مفہوم پر توجہ واستعارات میں توازن موجودہ تحریروں کا نمایاں وصف ہے۔افسانہ، ڈرامہ، مقالہ صحافتی اور ریڈیائی مضامین جدید نثر کی خاص اصناف ہیں۔اور اس طرز نگارش کے علمبرداروں میں محمد حسین ہیکل، طٰہٰ حسین، مصطفیٰ عبدالرازق، مصطفیٰ صادق الرافعی، عباس محمود العقاد، احمد امین، توفیق الحکیم، ابراہیم عبدالقادر المازنی، احمد حسن الزیات، احمد ذکی ابوشادی، محمود تیمور اور نجیب محفوظ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

علمی نثر: علمی نثر کا اسلوب فنی نثر سے مختلف، غیر ضروری تکلفات سے بے

نیاز، سادہ اور رواں ہوتا ہے۔ علمی نثر کے موضوعات بیحد متنوع لیکن انتہائی سہل اور پاکیزہ اسلوب میں بیان کئے جاسکتے ہیں۔ اس میں عبارت آرائی اور صنائع وبدائع کی بالکل ضرورت نہیں ہوتی بلکہ کسی مخصوص فن کو ذہن نشین کرانا مقصود ہو تو اس میں تشبیہات اور استعارات کی کثرت، رکاوٹ بن سکتی ہے۔ علمی نثر ادبی نشأۃ ثانیہ کے پہلے دن سے مؤثر اور طاقت ور ہونا شروع ہوگئی۔ اس کے موضوعات کا تنوع بڑھتا رہا۔ علمی نثر کے میدان میں محمد عبدہ، عبداللہ باشا فکری، محمد فرید وجدی، علی مشرفہ، محمد الخضر، حسین محمد مصطفیٰ المراغی، محمد عرفہ اور ابراہیم جبالی پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس عہد کے ادیبوں اور انشاء پردازوں نے یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ ان کے وسیع افکار وخیالات کی ادائیگی کے لئے محض جدید تعبیرات کافی نہیں ہیں اور اس کے لئے انھیں قدیم ادب کا مطالعہ ناگزیر ہے اس لئے کہ قدیم عربی ادب الفاظ اور تعبیرات سے اس درجہ مالا مال ہے کہ اس میں کسی فکر وخیال کی ادائیگی مشکل نہیں۔ مفہوم ومعانی کا ایک سیلاب ہے جو کلاسیکی اور رنگا رنگ تعبیرات کے ذریعے سامعین کے ذہنوں کی طرف امنڈتا چلا جاتا ہے۔ اس حقیقت کے ادراک کے نتیجے میں نئے لکھنے والے قدیم ادباء کے شاہکاروں کا مطالعہ کرنے لگے۔ اور اکثر مواقع پر قدیم اسالیب کی تقلید بھی کی گئی۔

مغربی ادب کے مطالعے نے بھی ہمارے نثر نگاروں کو متاثر کیا اور ان کی طرز نگارش میں مغربی اسلوب کی جھلک نظر آنے لگی۔ لیکن جو چیز جدید نثر میں سب سے زیادہ نمایاں ہے اور جس کی پابندی ادیبوں کی اکثریت برابر کرتی چلی آرہی ہے وہ ہے مفہوم ومعانی کی اہمیت اور اس کا لحاظ، الفاظ کی خاطر مفہوم کو قربان نہ ہونے دینا اور اس کی پابندی کے ساتھ نئے نئے اسالیب کو اختیار کرنا، ایسے بے جان اور

متروک الفاظ کے استعمال سے پرہیز جن کے لئے قاری کو ڈکشنری کی ورق گردانی کرنی پڑے۔ جدید عربی نثر کی مثال اس گل صنوبر سے دی جاسکتی ہے جو چمنستان علم ومعرفت میں آزاد بھی ہے اور پابہ گل بھی۔

عربی کے نثری اسالیب کے معیار کو بلند کرنے اور جدید لباس سے آراستہ کرنے کا سہرا مصر وشام کی علمی وادبی انجمنوں کے سر بھی ہے۔ اسی طرح آزادی واصلاح کی مختلف تحریکیں بھی اس سلسلے میں بہت معاون ثابت ہوئی ہیں، مثلاً جمال الدین افغانی کی تحریک یا انگریزوں کے خلاف احمد اعرابی باشا کی تحریک۔ یہ تحریکیں نوجوان ادیبوں کے لئے تحریر وتقریر صحافت وخطابت کے بہت اچھے مواقع فراہم کرتی تھیں۔ عربی صحافت ایک طرح سے عوامی رائے کی پابند ہوگئی اور اس سے ان کے حوصلے کو بڑھانے کا کام لیا جانے لگا۔ اعرابی تحریک کے زمانے میں ایک اخبار جاری کیا گیا جس کا نام تھا "التنکیت والتبکیت" یہ اخبار صرف ایک سال چل سکا لیکن وہ نصف صدی جو اعرابی تحریک سے شروع ہوتی ہے ادب کی تیز رفتار ترقی کا باعث بن گئی۔ اس دوران مصر کو ایک مرکزی اہمیت حاصل ہوگئی اور شام ولبنان سے ادیب وانشاء پرداز اور علماء بڑی تعداد میں مصر ہجرت کرنے لگے اور ان لوگوں نے مقامی ادیبوں اور عالموں سے مل کر مصر سے بہت سے اخبارات ورسائل نکالے، نئی نئی انجمنیں بنیں، چھاپے خانے وجود میں آئے اور مصر میں آداب وفنون کی دیکھ بھال کے لئے المجلس الاعلیٰ کا قیام عمل میں آیا۔

مغربی ادب کے تراجم

بیسویں صدی کے شروع میں فرانسیسی اور انگریزی ادب کو ترجمے کے

ذریعے عربی ادب میں منتقل کرنے کا کارنامہ جن لوگوں نے انجام دیا تھا ان میں فتحی باشا زغلول سرفہرست ہیں۔جن کی کتابوں نے عرب ذہنوں کو بہت متاثر کیا اور عالم عرب میں زندگی کے افق کو بے مثال وسعت عطا کی، انھوں نے گستاف لیبان اور دیمولے کی بہت سے کتابوں کو عربی میں منتقل کیا اور ہر ایک پر سیر حاصل مقدمے تحریر کر کے یہ بتایا کہ کس طرح اس کے اصولوں کو مصری زندگی پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔ٹھیک اسی وقت شام کے بہت سے ادیب صحافت کے ذریعے مصری زندگی کو متاثر کر رہے تھے۔ان میں یعقوب صرّوف (۱۹۲۷۔۱۸۵۲ء) مدیر "المقتطف" اور جرجی زیدان (۱۹۱۴۔۱۸۶۱ء) مدیر "الہلال" کا نام سرفہرست ہے۔ان کے علاوہ ترجمہ کی صحت و باریکی اور اسلوب وادا کے لحاظ سے ابراہیم عبدالقادر المازنی، اور ودیع فلسطین نے بہت شہرت پائی، مغربی ادب کی شاہکار کتابیں جو مختلف علوم، آداب اور تہذیب وتمدن کے موضوعات سے متعلق تھیں۔عربی میں منتقل ہونے کے بعد عرب ادیبوں، شاعروں اور انشاء پردازوں کے ذہن کو متاثر کرتی رہیں۔

عربی نثر کی ترقی میں صحافت کا اثر:

آج تک عربی کا نثری ادب، عربی صحافت سے متاثر ہو رہا ہے اور صحافت بھی ادب سے اثر پذیر ہے، چنانچہ وہ بھی الگ الگ خانوں میں بٹ گئی ہے یا اس کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ زندگی کے تمام گوشے اس میں سماتے ہوئے نظر آتے ہیں۔آج کی علمی، سیاسی، سماجی، مذہبی، تجارتی اور سائنسی صحافت اس کا ثبوت ہے۔اس لئے کہ ہر تنظیم اور ہر ادارے کو ایک میگزین کی ضرورت ہے جس

کے ذریعہ وہ اپنی مخصوص تحقیقات اور معلومات قاری تک پہنچائے۔انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں عربی صحافت کے عروج وترقی پر شیخ محمد عبدہ کے اثرات نمایاں ہیں۔الوقائع المصریۃ میں ان کے قلم کی روانی اور مہارت قابل دید ہے۔بے موقع نہ ہوگا اگر اس زمانے میں شائع ہونے والے اخبارات ورسائل کے ناموں کا ذکر کر دیا جائے اور ان کے میدان کار کا تذکرہ بھی اسی کے ساتھ ہو جائے۔

اس عہد کے سیاسی اخبارات ورسائل میں الاھرام، المقطم، المؤید، النیل، الوطن، اللواء، قابل ذکر ہیں۔علمی ادبی پرچوں میں الاداب، الأزھر، الاصلاح، الفتی، الفرائد، البستان، المقتطف اور الھلال مشہور تھے۔طبی رسائل میں الشفاء، الفوائد الصحیۃ، قانون سے متعلق پرچوں میں الحقوق اور المحاکم، زراعت سے متعلق رسائل میں مجلۃ الزراعۃ کا نام لیا جا سکتا ہے۔یہ اخبارات ورسائل صرف دارالخلافۃ قاہرہ ہی سے نہیں بلکہ اسکندریہ، طنطا اور اسیوط وغیرہ سے بھی نکلتے تھے۔شام میں بھی یہی حال تھا۔اس کے علاوہ اس طرح کے رسائل عراق، مراکش، ہندوستان اور اس سے بڑھ کر مہجری ادیبوں کی بدولت جنوبی شمالی امریکا سے بھی نکلے اور مقبول ہوئے۔

ملک شام ترک حکومت کے زیر نگیں آزادیٔ تقریر وتحریر سے بڑی حد تک محروم تھا۔وہاں کے اکثر ادباء مصر پہنچ گئے۔مختلف اخبارات ورسائل انھوں نے جاری کئے۔اسماعیل باشا جدید تہذیب کے دلدادہ تھے اور ادب اور اہل ادب کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ان کے زمانے میں نکلنے والے پرچوں میں سب سے قدیم ''کوکب الشرق'' ہے جو سلیم حموی نے ۱۸۷۳ء میں اسکندریہ سے جاری کیا تھا۔اس کے بعد اسکندریہ ہی سے ''سلیم تقلا'' اور ''بشارہ تقلا'' دو بھائیوں نے

۱۸۷۶ء میں ''الاھرام'' جاری کیا جو بعد میں قاہرہ منتقل ہوگیا اور آج تک وہیں سے نکل رہا ہے۔ پھر ادیب اسحاق اور سلیم نقاش نے ۱۸۸۰ء میں اخبار ''المحروسۃ'' شروع کیا۔ اس کے بعد ۱۸۸۸ء میں ''المقطم'' نکلا جو ۱۹۵۲ء تک جاری رہا۔

۱۸۸۰ء میں شروع ہونے والا اخبار ''المؤید'' اہم ترین قومی پرچہ ہے جسے شیخ علی یوسف اور شیخ احمد ماضی نے نکالنا شروع کیا تھا۔ ''المؤید'' کو وقت کے بڑے بڑے ادیبوں، رہنماؤں اور انشاء پردازوں کا تعاون حاصل رہا۔ وہ مصر کی ایک بولتی ہوئی زبان اور سچا ترجمان بن گیا بلکہ وہ پورے عالم اسلامی کی ترجمانی کرتا تھا۔ شیخ محمد عبدہ، سعد زغلول، قاسم امین اور ابراہیم المویلحی جیسے ادباء اس میں برابر مضامین لکھتے تھے۔

بیسویں صدی میں بہت سے پرچے نکلے جن میں ''جریدۃ الجہاد'' توفیق دیاب کی ادارت میں ''کوکب الشرق'' محمد حافظ عوض کی نگرانی میں ''المصری'' اور ''الاخبار'' دو بھائیوں علی امین اور مصطفیٰ امین کی زیر ادارت اس زمانے کے مشہور اخبارات ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں مصر کے جمہوریہ قرار دیے جانے کے ساتھ مشہور اخبار ''الجمھوریۃ'' جاری کیا گیا۔

جامع ازہر اور اس کے اثرات

عربی زبان وادب فصیح عربی نثر اور علوم اسلامی کی خدمت وحفاظت میں جامع ازہر کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ جامع ازہر نے تمام عالم عربی میں ادب کی عربیت اس کی رونق وزینت کو نہ صرف بچایا بلکہ اس میں چار چاند لگا دیے۔ اس مادر علمی کی کوکھ سے بے مثل عالم، ادیب، انشاء پرداز، خطیب اور شاعر ہر نسل اور ہر

زمانے میں پیدا ہوتے رہے۔

۷/رمضان ۳۰۱ء ہجری مطابق ۲۲/جون ۹۷۲ء میں اپنی تاسیس کے بعد سے آج تک جامع ازہر عالم اسلامی کی دینی قیادت اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا آرہا ہے۔اس کے علماء مشائخ کی رائیں اور فتوے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے مشعل راہ ہیں اور ان کے لئے طاقت وردلیل کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی بے چوں وچرا اطاعت کی جاتی ہے۔جامع ازہر نے ایسے بہت سے علماء کو جنم دیا جنھوں نے دنیا بھر میں تحریکوں کی قیادت کی۔۱۹۱۱ء میں ازہر کی بڑے علماء کی اعلیٰ اختیاری کونسل قائم کی گئی۔۱۹۲۷ء میں لجنۃ الفتاویٰ قائم ہوئی۔ان دونوں مجالس کا اثر عالم اسلام کی دینی رہنمائی میں بہت طاقت ور ہے۔۱۹۶۱ء میں مجمع البحوث الاسلامیہ قائم کی گئی۔جس نے دنیا بھر کے علماء اور مسلمانوں سے ازہر کا رشتہ جوڑ دیا۔جامع ازہر کی عظیم شخصیات میں امام عبدہ متوفی ۱۹۰۵ء سرفہرست ہیں۔دینی اصلاحات اور خود ازہر کی اصلاح میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ان کے علاوہ مصطفیٰ عبدالرازق، محمد مصطفیٰ المراغی، ابراہیم حمروش اور شیخ الظواھری بھی قابل ذکر ہیں۔ جامع ازہر کے جدید دور نے اپنے قدیم دور سے زبردست تہذیبی اور روحانی میراث حاصل کی اور اسے پوری امانت ودیانت کے ساتھ جدید دنیا تک ایک شمع ہدایت کی شکل میں پہنچادیا جس نے انسانیت کی رہنمائی کا گر لوگوں کو سکھایا اور اسلامی اخوت اور امن وآشتی کا پیغام ساری دنیا تک پہنچا دیا۔ازہر کے علمی حلقے جن میں مسلمان نوجوان جمع ہوتے تھے، علم دوستی، حق پرستی، ذوق ادب ومعرفت کو عام کرتے رہے۔اس طرح عالم عربی میں پستی جمود اور جہالت کی زنجیریں ٹوٹ گئیں۔اعرابی تحریک آزادی کے بانی قائد احمد اعرابی بھی جامع ازہر کے ہی فرزند

تھے۔انیسویں صدی کے آخر میں بعض علمائے ازہر نے انگریزی اور فرانسیسی زبان سیکھنے کی طرف توجہ کی تاکہ جدید مغربی تہذیب کی فکری اساس کو سمجھ سکیں اور مستشرقین کے ان شکوک وشبہات کا ازالہ کرسکیں جو وہ اسلام کے بارے میں پھیلاتے رہتے ہیں۔۱۹۶۹ء کے دوران شیخ الازہر، شیخ محمد الاحمدی الظواھری کے ہاتھوں جامع ازہر نے ایک باضابطہ یونیورسٹی کی حیثیت اختیار کرلی اس میں اصول الدین، لغت اور شریعت کی تین فیکلٹیاں قائم کی گئیں۔اعلیٰ تعلیم کے شعبے کھولے گئے۔جامع ازہر کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے عثمانی تسلط کے بعد عالم عربی میں عربی زبان کو مٹنے سے بچالیا اور ترکی زبان کے غلبہ سے اسی طرح عربی زبان کو محفوظ رکھا جس طرح انگریزی تسلط کے دور میں اس نے عربی زبان کو فرانسیسی اور انگریزی زبان کے غلبہ سے محفوظ رکھا۔

فنی اسلوب:

فنی تحریر کا نمونہ دراصل فصاحت وبلاغت سے بھرپور وہ رسائل پیش کرتے ہیں جن میں ادیب وانشاء پرواز کے افکار وخیلات کی عکاسی، اس کے احساسات وتصورات کی سچی اور خوبصورت تصویر کشی ہوتی ہے۔ان رسائل کے مخاطب عام طور سے لکھنے والے کے مخلص دوست اور اقارب ہوتے ہیں جن کی تعریف یا عتاب، تہنیت یا تعزیت، معذرت خواہی یا شکر گزاری ان رسائل وخطوط کے ذریعہ مقصود ہوتی ہے۔اس کے علاوہ لکھنے والوں کے اپنے احساسات مسرت والم، بدنصیبی وخوش بختی، امید ومایوسی جیسی آپ بیتی بھی ان رسائل میں پیش کی جاتی ہے۔اسی بنا پر ہم اسے نثر فنی کا نام دیتے ہیں۔

فنی نثر نشأۃ ثانیہ ادب کے اوائل میں اپنی آخری سانس لے رہی تھی لیکن یکا یک اس کے تن نازک میں شاہین کا جگر پیدا ہو گیا اور وہ اپنے سچے اور وفادار حامیوں کی بدولت نئی زندگی سے سرشار ہو گئی۔ عربی ادب کے قدیم شاہکار جو جدید طباعت کی سہولتوں سے فیض یاب ہو کر عام قاری کی دسترس میں آ گئے تھے اپنے اندر اسلوب وادا کی زبردست تاثیر رکھتے تھے۔ اس وقت کے اخبارات ورسائل اس کی اچھی نمائندگی کرتے ہیں۔ ادیبوں کی اکثریت عبارت آرائی کے بجائے مفہوم ومعانی کی اہمیت پر زور دینے لگی۔ ان لکھنے والوں میں ایک گروہ قدیم طرز تحریر کو اپنانا ضروری سمجھتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو صرف قدیم تہذیب وثقافت سے واقف تھے۔ ایک دوسرا گروہ جسے مغرب کی ادبی ثقافت سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملا تھا۔ جدید اسلوب اور دلچسپ معانی کا دلدادہ تھا۔ لفظ واسلوب ان کے نزدیک ثانوی درجہ رکھتے تھے۔ ایک تیسرا گروہ قدیم وجدید دونوں کے امتزاج کا قائل تھا اور بیک وقت دونوں کی خوبیوں کو اپنانے اور خامیوں سے دور رہنے کا عزم رکھتا تھا۔

اسی موڑ پر ہمیں دو پدر و پسر ابراہیم المویلحی اور محمد المویلحی نظر آتے ہیں جو بدیع الزماں کے طرز کو اپناتے ہیں۔ محمد عبدہ اور علی یوسف ابن خلدون کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ مصطفیٰ کامل اور اصحاب قطم یورپی طرز تحریر کو پسند کرتے ہیں۔ مرور زمانہ کے تہذیبی لین دین کے ساتھ یہ سارے اسلوب قریب قریب آ جاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ صحافت فنی تحریروں کے لئے ایک سازگار پلیٹ فارم کا کام کرتی تھی اور اس کی ترویج وترقی کا باعث بھی تھی۔ ادب وانشاء کی صلاحیت اور تحریر کا ملکہ قدیم علماء وادباء کی کاوشوں کے مطالعہ سے ہی حاصل ہو سکتا ہے اور نئے زمانے میں قدیم ادب کے مطالعہ کی سہولت نشر واشاعت کے جدید وسائل کی بدولت عربی کے ہر

قاری کو حاصل تھی۔اس کی بدولت اچھے لکھنے والوں کی تعداد میں یکا یک اضافہ ہوا جس کی مثال پچھلے زمانوں میں نہیں ملتی۔

فنی نثر کی مختلف رنگ:

عہد حاضر کے نقاد فنی نثر کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ہر ایک کی امتیازی خصوصیات الگ الگ ہیں۔ یہ تقسیم اس طرح سے ہے:۔

۱۔نثر اجتماعی یا سماجی تحریریں

اس طرز تحریر کے ذریعے سماجی حالات کا بیان ان کے مسائل کا حل اور سماج کی برائی کی اصلاح منظور ہوتی ہے۔نثر کی یہ قسم صحت عبارت کے ساتھ تکلفات سے دور وضاحت سے بھر پور غلو سے بے نیاز اور دلائل کی قوت تاثیر سے سرفراز ہوتی ہے۔ منطقی ترتیب کے لحاظ سے بھی اس تحریر کو چوکس ہونا چاہئے، کیونکہ اس کا مقصد کسی امر واقعہ کا بیان یا اصلاح ہے۔ یہاں شاعرانہ تخیل یا شعری پیرایۂ بیان کی ضرورت نہیں، سوائے ان چند مواقع کے کہ جہاں عوام کو کسی کام کے لئے ابھارنا اور ان میں جوش پیدا کرنا مقصود ہو لیکن اسے بھی معقول حدوں کے اندر محدود رہنا چاہئے اس لئے کہ سماجی حقائق حدوں کے پابند ہوتے ہیں۔عوامی اصلاح کی دینی تحریریں بھی نثر اجتماعی کا حصہ مانی جاتی ہیں۔

۲۔فنی نثر کی دوسری صحافتی نثر:

صحافت کی مختلف قسمیں ہیں۔مثلاً سیاسی صحافت، علمی صحافت اور فنی صحافت سیاسی اخبارات کی نثر واضح اور آسان ہوتی ہے جس کا مفہوم الفاظ کو پڑھتے ہی ظاہر

ہو جائے۔اس لئے کہ ان اخبارات کے مخاطب عوام وخواص دونوں ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے اوران پڑھ سب سے ان کا تعلق ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ بہت مختصر وقت کے لئے ان کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے ان کے اسلوب کی پیچیدگی مفہوم ومعانی میں گہرائی غیر ضروری ہے اس لئے کہ قاری نہ تو اسے سمجھنے کے لئے ذہن کو تھکانا چاہتا ہے اور نہ اس کے پاس اتنا وقت ہے۔

نثر اجتماعی کے لئے جہاں منطقی استدلال ضروری ہے اس کے لئے اس کی بنیاد علمی مسائل وحقائق پر ہے۔وہاں صحافتی نثر کے لئے منطقی استدلال کی ضرورت نہیں۔اس کے بجائے اس میں خطابت کا اسلوب زیادہ کارگر ہے اس لئے کہ عوام کو قائل کرنا اسی طرح ممکن ہے اور اس لئے بھی کہ سیاسی رجحانات زیادہ تر جذبات کو ابھارتے ہیں علمی حقائق سے انھیں کم ہی سروکار ہوتا ہے۔البتہ علمی اور فنی رسائل یا سیاسی پرچوں کے علمی وفنی کالموں میں عبارت آرائی مفہوم ومعانی کی گہرائی اچھی سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس کا مقصد علوم کی ترویج واشاعت اور ادب کی تعلیم وتربیت ہے۔یہ مخصوص کالم اور اس طرح کے رسائل صرف پڑھے لکھے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچتے ہیں۔

۳۔ادبی نثر

فنی نثر کی تیسری قسم ادبی نثر ہے۔یہاں الفاظ وتعبیرات کے انتخاب کی ضرورت ہوتی ہے۔یہاں ہر طرح کی ادبی نظم وتربیت تزئین وآرائش نہ صرف قابل تعریف بلکہ ضروری بھی ہے تاکہ عبارت کی تاثیر میں اضافہ ہو، سننے میں اچھی لگے اور دل پر اثر کرے۔اس لئے اس میں صنائع اور بدائع ہرگز ناپسندیدہ نہیں۔یہ

ضرور ہے کہ ان کی وہ کثرت مناسب نہ ہوگی جس سے قاری کا ذہن الجھ کر رہ جائے اور اصل مقصد سے دور جا پڑے۔ بہت زیادہ تصنع اور تکلف عبارت برائے عبارت یا نہایت مصنوعی اسلوب یہاں بھی قابل تعریف نہیں، بہترین ادب وہ ہے جس میں آمد ہو آورد نہ ہو اور جو خود بخود زبان قلم پر رواں ہو جائے۔ کھینچ کھینچ کر لایا نہ جائے۔ دل سے نکلے اور دل پر اثر کرے۔

نثر کے وہ فنون جو جدید مغربی تہذیب کے راستہ سے عربی زبان وادب میں رواج پا گئے وہ افسانہ نگاری، ڈراما نویسی، سوانح نگاری اور مقالہ نویسی ہیں۔ اس میدان کے مشہور لکھنے والے ہیں: احمد فارس الشدقی (۱۲۵۰ء)، عبداللہ باشا فکری (۱۸۸۹ء)، سید عبداللہ ندیم (۱۸۱۶ء)، شیخ محمد عبدہ (۱۹۰۵ء)، ابراہیم بک المویلحی (۱۹۰۶ء)، قاسم بک امین (۱۹۰۸ء)، شیخ علی یوسف (۱۹۱۳ء)، شیخ حمزہ فتح اللہ (۱۹۱۸ء)، سید لطفی منفلوطی (۱۹۲۴ء)، حنفی بک ناصف (۱۹۱۹ء)، شیخ عبدالعزیز جاویش (۱۹۲۹ء)، محمد بک المویلحی (۱۹۳۰ء) سید توفیق البکری (۱۹۳۲ء) ہیں۔

صحافتی نثر کے مشہور لکھنے والے عبدالقادر حمزہ، حافظ عوض، توفیق دیاب انطوان الجمیل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

انشا پرواز علماء میں لطفی السید، منصور فہمی، امین الخولی، علی مصطفیٰ مشرفہ، عبدالحمید بدوی، محمد رضا الشبیبی العراقی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

عیسائی مشنریوں اور نوآبادکاروں نے جب مشرقیت اسلام اور مصری تمدن پر زبان طعن دراز کی تو جمال الدین افغانی ارنیسٹ رینان کے مقابلے میں شیخ محمد عبدہ ہانوتو کے سامنے اور قاسم امین سے قلمی جہاد کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اس طرح مناظر ادیبوں کا کام بھی ان تینوں نے کیا۔ ان کے طنز وتعریض کا جواب

دینے کے ساتھ ساتھ ان تینوں نے اسلامی معاشرے کے اندر غیر اسلامی رسم ورواج کی اصلاح بھی کی تاکہ غیروں کو انگشت نمائی کا موقع نہ ملے۔

(ترجمہ تحریک)

احمد فتحی زغلول نے ۱۸۹۹ء میں فرانس کے سماجی ادیب ایڈمن ڈیمولان کی کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام عربی میں سر تقدم الانجلیز السکسونین۔ اس کتاب کے مطالعے سے عرب ادیبوں کو بیحد فائدہ ہوا اور اپنے معاشرے کی اصلاح کا مزید موقع ملا۔اس طرح محمد عمر نے ۱۹۰۲ء میں "حاضر المصریین وسر تأخرهم" تصنیف کی۔محمد المویلحی نے اپنی کتاب "حدیث عیسیٰ بن ہشام"، لکھی جس میں مصری اخلاق وعادات اور سماجی برائیوں کی بہت سچی تصویر کشی کی گئی ہے اسی طرح حافظ ابراہیم کی کتاب لیالی سطیح ،اور محمد لطفی جمعہ کی کتاب لیالی الروح الحائر منظر عام پر آئی۔

مصطفیٰ لطفی منفلوطی نے اخبار مؤید میں سلسلہ وار مضامین نظرات کے عنوان سے شائع کئے جس میں سماجی آلام ومصائب اور اخلاقی عیوب کے ازالے کی تدابیر بیان کی جاتی تھیں۔اسی زمانے میں مصطفیٰ کامل نے اپنے اخبار اللواء میں اپنے خطیبانہ مقالات شائع کئے جن کے ذریعے انھوں نے بیرونی تسلط کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کیا۔لیکن کچھ ہی عرصہ بعد موت نے مصطفیٰ کامل کے پرچم کو سرنگوں کر دیا۔ان کے بعد سعد زغلول نے ان کے منبر کو سنبھالا اور ہزادیب وخطیب کی نمائندگی کی۔ان کے پر جوش خطبات اور اثر انگیز مقالات نے بوسیدہ ہڈیوں میں بھی جان پیدا کردی اور خواص کی رائے نے رائے عامہ کو بیدار کر دیا۔ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹا ہوا سماج ایک متحد برادری کی شکل اختیار کر گیا۔

پچھلی صدی کی آخری چوتھائی میں ادب ایک کمزور سا پودا نظر آتا تھا۔ یکا یک عرابی باشا کی قیادت میں ادب نے ایک چھتنار، تناور درخت کی حیثیت اختیار کر لی۔ موجودہ صدی کے ربع اول میں عرب عوام سعد زغلول کے جھنڈے تلے متحد ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور نصف صدی کے آتے آتے عرب قومیت کے نعرے نے ان میں ایک قسم کا اتحاد پیدا کیا۔ اگر چہ بعد میں وہ بھی محض نام نہاد اور مصنوعی ثابت ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح لڑنے والی افواج کے قلب وروح کو گرماتے رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح زندگی کی خواہش رکھنے والے عوام کو ادب کی ضرورت ہے۔ ادب ان کے دلوں اور ذہنوں کی پیاس ہے۔ موسیقی ریز ترانے کا کام وقتی جوش ونشاط اور تازگی پیدا کرنا ہے۔ جب کہ پاک صاف ادب کی مہم عوام کو قیادت اور رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

مقامہ نویسی

مقامہ نویسی عربی نثر کی ایک منفرد قسم ہے جس کی مثال دوسری زبانوں میں نہیں ملتی۔ دراصل مقامہ کا اسلوب جس خاص قسم کا ہوتا ہے اس کے لئے دوسری کوئی زبان سازگار بھی نہیں ہوتی۔ مقامہ کی اسلوب تحریر کی بنیاد سجع وقوافی، فاصلے، الفاظ ومعانی کی تحسین وآرائش پر ہوتی ہے۔ اس میں فصاحت وبلاغت کی تمام خوبیاں اور صنائع وبدائع کا برمحل استعمال کیا جاتا ہے۔

اپنے مقصد وغرض کے اعتبار سے مقامہ قصہ اور مقالہ سے مختلف ہے۔

مقامہ نویسوں نے یہ اغراض ومقاصد اپنے تجربہ، ذوق اور سلیقہ کی روشنی میں متعین کئے ہیں۔ مقامہ کی نمایاں خاصیت یہ ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں جب

سے طرز نگارش کی ابتدا ہوئی ہے۔اس وقت سے بارہویں صدی کے اواخر تک جب کہ انشاء پردازوں نے اس فن کو از سر نو زندہ کیا،اس میں کوئی بڑی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔چنانچہ شروع سے لے کر اب تک اس کے مقاصد وصف، تحلیل و تجزیہ، جذبات کا اظہار اور اس سے تخاطب، نکتہ آفرینی اور تعلیم و تلقین پر مشتمل ہیں۔ان کے علاوہ سب سے اہم غرض جو ہر مقامہ کے اندر موجود رہتی ہے خواہ ان چھوٹے چھوٹے مقاصد میں وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں وہ ہے آرائش و جمال اور فہام وافادہ۔ظاہر ہے یہ مقصد ہر صنعت کے اندر موجود ہوتا ہے۔

وصفی مقامات میں انسان، حیوان، مناظر، شہر و دیہات، قیمتی ساز و سامان کے اوصاف پڑھنے کو ملتے ہیں۔جب کہ تحلیلی و تجزیاتی مقامات میں لکھنے والا، کسی ایک شخصیت کی تصویر پیش کرتا ہے۔یہ شخصیت عام طور سے مفروضہ ہوتی ہے یا اس کا نام فرضی ہوتا ہے۔اس کے حالات وکوائف، اس کی زندگی سنجیدہ، طربیہ یا مزاحیہ گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے، کبھی حقائق اور واقعات کبھی خیالی وظنی وتخمینی چیزیں پیش کی جاتی ہیں۔جن میں طنز ومزاح کا پہلو غالب ہو۔البتہ یہ ضروری نہیں کہ مقامہ کا موضوع لازمی طور سے تفریحی اور ہزل کا ہی اختیا کیا جائے، اور اگر اس کے ذریعے کسی شخصیت کی سنجیدہ فکر انگیز تصویر کشی کی گئی ہو تو اسے مقامات کی فہرست سے نکلنے پر مجبور ہونا پڑے۔

عاطفی اور جذباتی مقامات میں انسانی احساس وشعور کی عکاسی ایسی عبارت اور ایسے اسلوب میں کی جاتی ہے جس میں جذبات کی لطافت اور تاثیر باقی رہ سکے اور اس کے ذریعے موعظت ونصیحت کا جو سبق دینا مقصود ہے وہ بتمام وکمال قاری تک منتقل ہو سکے۔اسلوب ایسا ہو جس میں نثر ہونے کے ساتھ نظم وشعر کی خوبیاں

بھی جھلک رہی ہوں اور کہیں کہیں لکھنے والے پر ایک قادرالکلام شاعر ہونے کا گمان ہونے لگے۔ظاہر ہے کہ اس کے بغیر وہ مقامہ لطیف انسانی جذبات کو بیدار نہ کر پائے گا۔نکتہ سنجی اور بات سے بات پیدا کرنے کی صلاحیت کاتب میں بدرجہ اتم موجود ہونا چاہئے۔

دراصل نکتہ آفرینی اور ندرت کے میدان میں مقامات کی حیثیت افسانہ قصہ سے کچھ بڑھ کر ہی ہے۔اس لئے کہ اس میں قصہ نگاری کے لئے اسلوب اور اسٹائل اور اسلوب اور اسٹائل کے لئے قصہ نگاری مقصود ہوتی ہے۔اس طرح اسلوب اور قصہ مقامہ کے قالب میں شروع سے آخر تک ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں۔

ہاں تعلیمی اور تدریسی غرض سے لکھے گئے مقاموں کی غرض وغایت بالکل جداگانہ ہوگی، وہاں قاری کو کسی فکر ونظریہ یا کسی زبان اور اس کے قواعد کی تعلیم دینا مقصود ہوگا۔لیکن یہاں بھی مقامہ کو بیان وبلاغت کے معیار سے گھٹنا نہیں چاہئے۔اس لئے اگر مقامہ کے اسلوب میں یہ خوبی ہی نہ رہی تو نہ وہ لوگوں کو یاد رہ سکتا ہے اور نہ اسے دوستوں کی کسی محفل میں سنایا جاسکتا ہے۔

اس طرح مقامہ اپنے موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے عربی زبان میں ایک مستقل صنف کی حیثیت رکھتا ہے اور ادب منثور ومنظوم کی کوئی دوسری صنف اس کی جگہ نہیں لے سکتی کہ اپنے موضوع کے اعتبار سے مقامہ درحقیقت ذوق وخیال اور تفہیم وتدریس کے درمیان ایک وسطی کڑی ہے، شعر ونثر دونوں کی خاصیتیں اس میں بیک وقت پائی جاتی ہیں۔حکایت اور تصویر، تعلیم اور تزئین، ساخت وقالب، فن برائے فن، مفہوم ومعانی، غرض نفسیاتی اور اجتماعی زندگی کے سارے ہی رنگ مقامہ کی قوس قزح میں سموئے جاسکتے ہیں۔

حمد

صبیح رحمانی (پاکستان)

کر رہے ہیں تیری ثنا خوانی
سوچتی دھرتی ، بولتا پانی
تو ہے آئینہ ازل یا ربّ
اور میں ہوں ابد کی حیرانی
تیرے جلووں کے دم سے لیل و نہار
تیرے سورج کی سب درخشانی
گونجتا ہے ثنا کے نغموں سے
گنبدِ جاں ہے میرا نورانی
پار ہوتی نہیں مرے مولا
درد کی سرحدیں ہیں طولانی
تجھ سے بخشش کا ہے تمنائی
تیرا بندہ صبیح رحمانی

غزل

رشید کوثر فاروقی

ہر بات تو کہنا مگر اک بات نہ کہنا
خود کردہ کو مجبوریِ حالات نہ کہنا

سرکار نے تعزیر کا اعلان کیا ہے
اندھیر ہو دن میں تو اسے رات نہ کہنا

کیا بات ہے واعظ ترے انداز بیاں کی
جو بات ہے کہنے کی وہی بات نہ کہنا

یہ شخص تو بس اپنی ہی دنیا میں مگن ہے
خوش باش تو ہے، اس کو خوش اوقات نہ کہنا

تم لوگ مہذّب ہو، خرافات نوی کے
رکھ لینا حسیں نام، خرافات نہ کہنا

دیکھو تو سہی خشک زمینوں کی دراڑیں
بارش ہو سمندر پہ تو برسات نہ کہنا

پانی کے کٹورے کو بھی محسوب کرے ہے
تاجر کی ضیافت کو مدارات نہ کہنا

دنیا کبھی ایسوں کو معافی نہیں دیتی
سب جرم تو کرنا، کبھی حق بات نہ کہنا

غزل

محمد حسین فطرتؔ

بے مائگیٔ عشق کا ہے خشک و تر پہ راج
کرتی رہے گی عقل زیاں کار احتجاج

مہلت ہے شاق طبعِ مشقت پسند پر
انسان ڈھونڈھتا ہے فراغت میں کام کاج

امید و آرزو سے عبارت ہے زندگی
انسان کا وجود ہے سرتاپا احتیاج

نغموں کا حسنِ معنوی کچھ اور چیز ہے
قوسِ قزح کا حسن ہے رنگوں کا امتزاج

چارہ گرانِ وقت نے فطرت سے یہ کہا
بیمارِ عاشقی کا جہاں میں نہیں علاج

قارئین حضرات!

ملک کی صورت حال اس بات کو لازم قرار دے رہی ہے کہ انسان دوستی اور اسلام کے تعارف کا کام خوب کیا جائے۔

لہٰذا ہر اس شخص سے جو اسلام کے لیے دل رکھتا ہے اس سے التجا ہے کہ اس کام کو شروع کرے اور اس کی ابتدا مندرجہ ذیل کتابوں کے مطالعہ سے کرے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کتابوں کی تقسیم کا کام کرے۔ انشاء اللہ ہماری نیت پر اللہ تعالیٰ نتیجہ لائے گا۔

ان تمام کتابوں پر جب کہ تقسیم کے لئے ہو اور ان کی تعداد پچاس پچاس سے کم نہ ہو۔ 50% رعایت

سیرت رسول اکرمؐ	90/-
مقام انسانیت	20/-
پیام انسانیت	15/-
اسلام کا تعارف	40/-
Muhammed the last prophet	90/-
Stories of the prophet ?	55/-
Islam an Introduction	40/-
Islam and the world	120/-
नबी-ए-रहमत	120/-
आदर्श शासक	25/-
मानवता का स्तर	20/-
मानवता का संदेश	20/-
इस्लाम एक परिचय	20/-
नबियों के किस्से I-II	80/-

رابطہ کے لئے ہمارا پتہ:

ACADEMY OF ISLAMIC RESEARCH & PUBLICATIONS
P. O. BOX 119 NADWATUL ULAMA LUCKNOW-226007 (INDIA)
PH:0522-2741539 Fax:2740806 Mob:9335223411-Email: info@airpindia.com

نوٹ: منی آرڈر/ڈرافٹ اس نام سے بھیجیں

ACADEMY OF ISLAMIC RESEARCH & PUBLICATIONS